شیفتہ اور غالب

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

غالب اکیڈمی، نئی دہلی

Galib Academy
Kali Das Ek MUTALIYA

8625-

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

غالب اکیڈمی، نئی دہلی

اشاعت اوّل۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

تعداد:- ایک ہزار

طباعت:- جمال پرنٹنگ پریس دہلی

قیمت:- ۳۵ روپے

انتساب

جناب نواب محمد رحمت اللہ خاں شروانی

کی نذر

برگِ سبز است تحفۂ درویش

فہرست

اظہارِ تشکر

'غالب اور آنند' کی ترتیب و اشاعت میں بہت سے بزرگوں اور دوستوں کی کرم فرمائیاں شامل رہی ہیں۔ ان میں سرفہرست اسم گرامی جناب حکیم عبدالحمید صدر غالب اکیڈمی کا ہے آپ نے مسودہ کو پسند فرمایا اور اکیڈمی سے شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اُردو کے نامور محقق اور ماہر غالبیات مالک رام صاحب نے مسودہ کو بہ نظرِ اصلاح ملاحظہ فرمایا۔ اس کی بہت سی خامیاں دور کیں اور بزرگانہ مشوروں سے نوازا۔ مزید برآں اپنا قیمتی وقت صرف کر کے رائے عالی سے نوازا جسے ... کے عنوان سے شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔

جناب نواب محمد رحمت اللہ خاں شروانی کی ذات گرامی مغتنمات میں سے ہے آپ کی علم دوستی اور علم پروری اظہر من الشمس ہے۔ آپ نے ازراہِ علم نوازی اس کتاب کو اپنے نام منسوب کرنے کی اجازت دی اور تالیف کے سلسلہ میں اپنے فقید المثال کتاب خانے سے استفادے کے مواقع فراہم کئے۔

محب گرامی ایم۔ حبیب خاں صاحب نے ہر ہر قدم پر اعانت کی، کتابت سے لے کر طباعت تک تمام مراحل اپنی نگرانی میں طے کرائے اور اپنے خلوص سے مجھے بہت سی پریشانیوں سے نجات دلائی۔ جناب ذہین حسن نقوی سکریٹری غالب اکیڈمی نے ذاتی دلچسپی لے کر کتاب کو شائع کرایا۔

ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء　　　　　محمد ضیاء الدین انصاری

مقدمہ

دسویں صدی عیسوی کے آخر میں جو مسلمان یہاں آئے، وہ افغانستان سے آئے تھے کچھ مدت بعد ایرانیوں نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ ان دونوں کی زبان فارسی تھی۔ جب تیرھویں صدی کے آغاز میں یہاں اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو قدرتاً فارسی راج دربار کی زبان ٹھہری، حکومت کا سارا کاروبار فارسی میں ہونے لگا۔ حکمرانوں اور امرار سے وابستہ علمار اور دانشور طبقے نے اپنی تصنیف و تالیف میں بھی یہی زبان استعمال کی۔ ان کے ساتھ خط و کتابت بھی لامحالہ اسی زبان میں ممکن تھی حکومت نے یا علمار نے علوم و فنون کی ترویج یا اپنے ہم مذہبوں کو تعلیم دینے کے لیے جو مدارس قائم کیے۔ ان میں ذریعہ تعلیم بھی فارسی تھی، کلام الملوک ملوک الکلام تو ہے ہی۔ یہاں کی آبادی نے دیکھا کہ اگر ہمیں ارباب حکومت سے تعلق قائم کرنا ہے، ان کا موردِ الطاف و کرم بننا ہے، ان کے دلوں میں اپنے علم و عقل کی ساکھ پیدا کرنا ہے، تو لازم ہے کہ فارسی سیکھیں تاکہ وہ ہماری سُن اور سمجھ سکیں اور ہم ان کی۔ یہی احساس تھا جس نے یہاں کے ہندوؤں کو فارسی اور اس میں پوری استعداد حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔

رفتہ رفتہ ہندوؤں نے فارسی کی تحصیل میں اتنی ترقی کی کہ استادوں کے کان کاٹنے لگے، بالخصوص کائستھوں میں بعض بہت ممتاز ادیب پیدا ہوئے۔ یہ امر واقع ہے کہ کائستھوں نے فارسی میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس کے خاص اسباب ہیں، جن کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں ہے۔

آخری دور میں ہرگوپال بھٹناگر (کائستھ) سکندرآبادی متخلص بہ تفتہ مشہور استاد گزرے ہیں۔ کلام کی مقدار اور معیار کے پہلو سے ہندوستان کے بہت کم فارسی گو ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حالات کی تبدیلی کے باعث فارسی کی تدریس و تعلیم بے اعتنائی کا شکار ہو گئی ہے اور مستقبل میں بھی اس میں بہتری کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تفتہ

کے دیوان آسانی سے دستیاب بھی نہیں ہوتے۔ وہ ایک مرتبہ چھپے تھے اور دوبارہ ان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی ایسے میں یہ امید رکھنا کہ کوئی اللہ کا بندہ تفتہ کے کلام کا مکمل جائزہ لے کر ہندوستان کے فارسی ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کرے گا۔ امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا !۔

ہمارے نزدیک اب تفتہ کی اہمیت بس اتنی رہ گئی ہے کہ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ اس وقت تک غالب کے جتنے خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ تفتہ ہی کے نام ہیں ان خطوط کے سرسری مطالعے سے بھی استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات کی جو تصویر اُبھر کے ہمارے سامنے آتی ہے، وہ بے حد دل کش ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ شاگرد نے اپنا کلام استاد کی خدمت میں بھیجا، استاد نے اس پر حسب ضرورت اصلاح دی اور اسے شاگرد کے پاس واپس بھیج دیا۔ یوں بات رسمی تعلقات سے آگے نہیں بڑھتی۔ لیکن غالب کے تفتہ سے تعلقات کا عالم ہی دوسرا ہے۔ ان میں قرب اور یگانگت کا اندازہ ان خطوط سے لگایا جا سکتا ہے؛ جو غالب نے تفتہ کو لکھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا دونوں ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات میں شریک، نجی مسائل میں مشورہ، لین دین، آپسی دکھ درد میں شریک، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک میر مہدی مجروح کے سوائے غالب کا کوئی دوسرا شاگرد استاد کے اتنا قریب نہیں تھا جتنا تفتہ۔

ضرورت تھی کہ غالب اور تفتہ کے تعلقات اور تفتہ کے تصنیفی کارناموں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ بدقسمتی سے تفتہ کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ دراصل اس کے لیے جتنی محنت اور کاوش کی ضرورت ہے، وہ نہیں کی گئی، بہرحال جو کچھ میسّر تھا۔ جناب ضیاءالدین انصاری نے یکجا کر دیا ہے گویا کام کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اب خدا جس کو توفیق دے وہ اپنی محنت سے اس پر عمارت کھڑی کر دے

ہمیں ضیاءالدین انصاری صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے ہم سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔

مالک رام

نئی دلی ۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۴ء

تفتہ کے حالاتِ زندگی

تفتہ اُن کم نصیب شعرا میں ہیں۔ جن کی طرف ہمارے محققین، ناقدین اور تذکرہ نگاروں کی نگاہِ التفات کم ہوئی ہے۔ وہ اپنے عہد میں بھی کم التفاتی کا شکار رہے اور آج بھی بے توجہی کا شکار رہتے ہوئے ہیں حالانکہ بحیثیت شاعر اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے، اور مسلم الثبوت اساتذہ سخن کے علاوہ شاید ہی کوئی شاعر ان کے مرتبے کو پہنچ سکے۔ اس لحاظ سے یہ بات اور بھی زیادہ قابلِ افسوس ہو جاتی ہے کہ تفتہ پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ نتیجۃً وہ آج بھی قعرِ گمنامی میں پڑے ہیں۔ دنیائے ادب آج انھیں بالکل فراموش کر چکی ہے حیرت تو یہ ہے کہ معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی انہیں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اکثر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔

جن تذکرہ نگاروں نے تفتہ کو اپنے تذکروں میں شامل کیا ہے ان میں نصر اللہ خاں خویشگی مؤلف گلشن ہمیشہ بہار، سید علی حسن خاں مؤلف صبح گلشن، محمد مظفر حسین صبا مؤلف روزِ روشن اور لالہ سری رام مؤلف خم خانہ جاوید کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان سب کا ماخذ ایک ہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ سب کی فراہم کردہ معلومات بڑی حد تک یکساں ہیں۔ یہ ساری معلومات بڑی مختصر اور تشنہ ہیں۔ ان سے ہماری کسی طرح بھی سیری نہیں ہوتی۔ ان کے علاوہ جناب مالک رام نے "تلامذہ غالب"، عرش ملسیانی نے فیضانِ غالب میں اور عبدالرؤف عروج نے "بزم غالب" میں بھی تفتہ کا ذکر کیا ہے۔ عرش ملسیانی نے واضح طور پر مالک رام صاحب سے استفادہ کیا ہے اور عبدالرؤف عروج نے تو سراسر تلامذہ غالب کی خوشہ چینی کی ہے اور بڑی حد تک اس سے نقل بھی کی ہے۔ اس طرح سب سے

زیادہ مفصل اور جامع معلومات مالک رام صاحب نے پیش کی ہیں۔ آپ نے روشِ عام سے ہٹ کر تفتہ کے خاندانی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

تفتہ، مرزا غالب کے ارشد تلانذہ میں تھے۔ وہ تفتہ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کا اظہار غالب کے متعدد خطوط سے بھی ہوتا ہے۔ اس نسبت سے بھی مرزا غالب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ غالب کے اس چہیتے شاگرد پر تفصیلی، محققانہ اور ناقدانہ کام کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور تفتہ ہر طرف سے محروم توجہ ہی رہے۔ ممکن ہے اس عام بے توجہی کا سبب یہ رہا ہو کہ تفتہ اول و آخر فارسی کے شاعر تھے، اردو کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوئے اور فراہم شدہ معلومات کے مطابق اردو میں صرف ایک قطعہ کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا لیکن فارسی گو شعرا کے تذکروں میں بھی ان کا کوئی حال نہیں ملتا۔

تفتہ سکندر آباد کے ایک کایستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سکندر آباد صوبہ اتر پردیش میں ضلع بلند شہر کا ایک قدیمی قصبہ ہے۔ اس میں قدیم ترین خاندان کایستھ حضرات ہی کا ہے۔ لیکن تفتہ کے کایستھ ہونے کے سلسلہ میں تذکرہ نگاروں میں کسی قدر اختلاف ہے۔ تذکرہ صبح گلشن میں انھیں قوم برہمن سے بتایا گیا ہے[۱]:

"منشی ہر گوپال از قوم برہمن متوطن اضلاعِ شاہجہاں آباد و از ارشد تلامذۂ میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی والا نژاد است"[۱]

لیکن دوسرے تذکرہ نویسوں نے انھیں کایستھ ہی لکھا ہے اور یہی درست ہے۔ ان کے خاندان کے دیگر افراد اب بھی سکندر آباد میں مقیم ہیں

---

[۱] صبح گلشن: مؤلفہ سید علی حسن خان۔ ص ۸۷

اور بھٹناگر کا لیستھ کہلاتے ہیں۔ خود تفتہ کا مکمل نام منشی ہرگوپال بھٹناگر تفتہ سکندر آبادی ہے۔ اس طرح ان کا بھٹناگر کا یستھ ہونا مستند ہو جاتا ہے۔ ان کے اجداد سلطان سکندر لودی کے عہدِ حکومت میں سکندر آباد میں آکر آباد ہو گئے تھے، اور حکومتِ وقت کی طرف سے عہدۂ قانون گوئی پر فائز ہوئے اسی کے ساتھ کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی تھی۔ یہ عہدہ موروثی ہو گیا۔ اور نسلاً بعد نسلٍ اسی خاندان میں چلتا رہا۔ تفتہ بھی مدتوں اسی عہدے پر فائز رہے۔

تفتہ کے سالِ پیدائش کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب نے ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰/۱۷۹۹ء) لکھا ہے البتہ ماہ و تاریخ کا کہیں مذکور نہیں ہے۔ ان کی تعلیم قدیم طرز پر علوم متداولہ میں گھر ہی پر ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد موتی لال کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اسی ابتدائی تعلیم کا اثر تھا کہ انھیں فارسی زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی اور ذاتی شوق اور مطالعہ سے اس میں مہارت حاصل کرلی اور تمام عمر اسی میں مشقِ سخن کرتے گزار دی۔ اس طرح فارسی سخن سرائی میں انھوں نے وہ مرتبہ حاصل کر لیا جو ہندوستان میں کم شاعروں کو نصیب ہوا۔

ملازمت کے سلسلے میں تفتہ پہلے اپنے وطن سکندر آباد میں منصبِ قانون گوئی پر فائز رہے پھر کچھ عرصے کے لیے کاشی پور ٹھاکر دوارہ ضلع مراد آباد صوبہ اترپردیش چلے آئے۔ صاحبِ گلشن ہمیشہ بہار، نصراللہ خاں خویشگی کا بیان ہے[1]

> "بہ تحصیلداری کاشی پور ٹھاکر دوارہ ضلع مراد آباد در عمال ملازم بود۔ حالا شنیدہ ام کہ بہ تخفیف در آمدہ۔ معلوم ندارم کہ دریں ولا کدام کجاست۔"

دراصل تفتہ اول و آخر شاعر تھے۔ دنیوی جھگڑے ان کے لیے وبالِ جان

---

[1] گلشن ہمیشہ بہار: مؤلفہ نصراللہ خاں خویشگی۔ ص ۹۹

تھے۔ وہ گوشۂ تنہائی میں زندگی گزارنا چاہتے۔ ملازمت کی پابندیاں ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ لہٰذا اس طرف دل جمعی سے کام نہ کرسکے اور بالآخر ملازمت سے قطع تعلق کرلیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے ریاست جے پور سے منسلک ہوگئے لیکن اس کو بھی جلد ہی ترک کر دیا۔ جناب مالک رام کا بیان ہے، لہ

"انگریزی محکمہ بندوبست میں مدتوں قانون گو رہے۔ لیکن شاعری کے شوق میں نوکری کو خیرباد کہہ دی۔ ۱۸۵۰ء میں تھوڑے عرصے کے لیے ریاست جے پور میں بھی ملازمت کا تعلق ہوگیا تھا لیکن یہ کھکھیڑ بھی زیادہ دن تک نہ سہہ سکے اور جلد ہی مستعفی ہوگئے۔"

گلشن ہمیشہ بہار ۱۸۵۲-۵۳ء کے درمیان کی تالیف ہے۔ یہ پہلی بار رجب ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے مؤلف کے بیان کے مطابق تفتہ کاشی پور میں ۱۸۵۲-۵۳ء تک ملازم رہے۔ اس طرح جناب مالک رام کا یہ بیان کہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد تفتہ ۱۸۵۰ء میں ریاست جے پور سے وابستہ ہوگئے تھے۔ کچھ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ یقیناً ۱۸۵۳ء میں یا اس کے بعد قائم ہوا ہوگا۔

ان امور سے ہمیں تفتہ کی افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ آزاد منش انسان تھے۔ ان کی آزاد روی کسی قسم کی پابندی کو گوارا نہ کرتی تھی۔ اسی بنا پر انھوں نے ایک سے زاید بار ملازمت کو خیرباد کہا۔

خانگی زندگی کے سلسلہ میں تفتہ خاصے خوش نصیب رہے۔ ان کی ازدواجی زندگی کامیاب رہی۔ اللہ نے انہیں اولاد بھی خاصی دی۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی سنِ شعور کو پہنچے۔ لڑکوں کے نام امراؤ سنگھ اور پیتمبر سنگھ تھے

لہ تلامذۂ غالب - ص ۶۳

صاحبزادی اور پتیمبر سنگھ کی وفات تفتہ کی حیات ہی میں ہو گئی تھی۔ بڑے لڑکے امراؤ سنگھ نے طبعی عمر پائی اور ان کے بعد تک زندہ رہے۔ پتیمبر سنگھ کی جدائی کا صدمہ تفتہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کوہِ الم کا بار اٹھانا اور صبر و قرار کا دامن تھامے رہنا ان کے لیے بڑا مشکل تھا۔ شاعری کر کے دل بہلانے اور غم غلط کرنے کی کوشش کرتے اس کی وفات پر انھوں نے ایک طویل مرثیہ کہا جو ۲۲۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی کیفیتِ قلب و جگر کا بڑے پُر درد الفاظ میں اظہار کیا ہے۔ یہ مرثیہ ان کے دیوان دوم میں ملتا ہے۔ اسی بیٹے کی یاد میں انھوں نے "تضمین گلستاں" نظم کی۔ اس کے شروع میں انھوں نے "سببِ تالیف" کے عنوان کے تحت اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اور پتیمبر سنگھ کو یاد کر کے خون کے آنسو روئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زفرزندانم آں فرزندِ کوچک | کہ پتیمبر ہے خواندیش ہر یک
چہ پتیمبر در امرِ خیر ساعی | چہارم مصرعے بود از رباعی
چہ پتیمبر عزیزِ مصرِ جانہا | زلیخائے متاعش کاروانہا
چہ پتیمبر چراغِ خانۂ من | دلِ من، جانِ من جانانۂ من

سخن رانم ز پتیمبر در انجا | دُر افشانم ز پتیمبر در انجا

بگریم در سخن فزا یم آبے | نویسم بعد از اں نادر کتابے
نشود تا زندہ پتیمبر دگر بار | دہد داد مسیحائیم ہر بار

تفتہ نے اُردو میں کبھی مشقِ سخن نہیں کی۔ ہمیشہ فارسی ہی میں "پرورشِ لوح و قلم" کرتے رہے۔ اُردو میں ان کا صرف ایک قطعہ ملتا ہے۔ جو انھوں نے مرزا غالب کی وفات پر نظم کیا تھا۔ یہ قطعہ حسبِ ذیل ہے ؎

غالبؔ وہ شخص تھا ہمہ داں جسکے فیض سے | ہم سے ہزار ہیچمداں نامور ہوئے
فیض و کمال، صدق و صفا اور حسن و عشق | چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پا و سر ہوئے

فارسی میں تفتہ نے چار ضخیم دیوان، "تضمین گلستاں" اور "سنبلستان" بطور یادگار چھوڑے۔ "سنبلستان"، "شیخ سعدی کی لافانی تصنیف "بوستاں" کے جواب میں نظم کی گئی۔ اس کا نام مرزا غالب نے تجویز کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کو یہ نام قبول کرنے میں کچھ تامل تھا۔ لیکن غالب نے اسی نام پر اصرار کیا۔ ایک خط میں وہ تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"صاحب سنبلستاں سے کیوں گھبراتے ہو؟ میں تمہارے گھبرانے سے گھبراتا ہوں۔ رُخ کو گل اور زلف کو سنبل فرض کرتے ہیں۔ سنبلستان میں کیا عیب ہے۔ اور اگر نہیں پسند تو یہ قصہ ہی جانے دو۔"

اس کا پہلا ایڈیشن رمضان ۱۲۰۰ھ میں شیو سہائے کے زیر اہتمام مطبع مرآت الصحائف میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس کی کتابت اور طباعت دونوں بہت ناقص ہیں۔ تفتہ نے اس کا ایک نسخہ غالب کی خدمت میں بھیجا۔ انکو بھی طباعت وغیرہ بہت ناپسند ہوئی جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا۔

"تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے، کیا بُری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستان ایک معشوق خوب رو ہے، بدلباس ہے۔"

یہ ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت، طباعت اور کاغذ سبھی بے انتہا ناقص ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے مطالعہ میں بڑی الجھن ہوتی ہے۔ البتہ اس کا دوسرا ایڈیشن جو ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں مطبع نول کشور

سے شائع ہوا - بہت صاف اور عمدہ ہے اور مطبع نول کشور کی روایتی خوبیوں کا حامل ہے - یہ ۴۶۰ صفحات پر مشتمل ہے -
' تضمین گلستاں '، ۱۲۷۴ھ میں مطبع نول کشور کان پور سے شائع ہوئی - یہ ۲۵۱ صفحات پر مشتمل ہے - اس کی کتابت و طباعت پر لحاظ سے معیاری ہے -

---

مرزا غالب سے تعلقات

تفتہ مرزا غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے۔ غالب ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی ہر طرح سے دل جوئی کرتے تھے۔ تفتہ بھی اپنے استاد کے ساتھ انتہائی عقیدت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ تفتہ کے نام مرزا غالب کے جو خطوط ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفتہ ان کے عزیز ترین شاگرد ہی نہیں بلکہ بے تکلف دوست بھی ہیں۔ ان خطوط سے یہ بھی ترشح ہوتا ہے کہ غالب ان کو اپنی اولاد کی برابر عزیز رکھتے تھے تفتہ بھی ان کا اسی حیثیت سے احترام کرتے تھے۔ ان کو اگرچہ اپنے کمال فن پر ناز تھا تاہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ غالب کا فیضان ہے۔ "تضمین گلستان" کی ابتداء میں مرزا غالب کو بڑے احترام سے خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی ہمہ دانی اور اپنی ہیچمدانی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے ؎

سخن اینست و بس من ہیچ بنوم — برآں نکتہ رس من ہیچ نبوم
بود تا میرزا غالب زمن شاد — خراب من سراسر باشد آباد
فدائی میرزا غالب دل و جاں — گدائی میرزا غالب دل و جان
چہ غالب ہم نوائے قیصر و جم — چہ غالب میرزا اے قیصر و جم
باہل فارس غالب، غالب ما — بہ از عرفی و طالب غالب ما
ذرے از درج توراں چشم بد دور — مگو از سایہ کاینجا سربسر نور
دگر از ہند گفتن رو سیاہی ست — گواہ تفتہ از من تا بماہی ست
چو گویم تا چہ رحمت کرد با من — دگر نہ گو جناب او، کجا من
رسد نازش چہا بر فرفدانم — رسانید از زمیں بر آسمانم

بود ہر ذرّہ او آفتابے — درش را خواندہ ام روشن کتابے
اگر صد دفتر از مدحش نگارم — یکے باشد یکے از صد ہزارم

مرزا غالبؔ کی وفات پر انہوں نے فارسی میں جو ترجیع بند نظم کیا ہے اس سے بھی اسی عقیدت و احترام کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء میں مطبوعہ دیوان کے ایک طویل قطعے میں بھی غالب کے تکرار درفن کی ستایش کی ہے اور بیس سال سے ان سے مشورۂ سخن کرتے رہنے کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

چہ حاجت کہ آرم بلب نامِ شاں — مے عیش تا حشر در جامِ شاں
ازیں جملہ بہ تر یکے اہلِ دل — خوش آزاد مردے بحق مشتغل
اسد نام، غالب تخلص ہمی — ز آگہ دلی ہا نہ غافل دمی
لقب میرزا نوشہ۔ او را دگر — وزیں نام در دہر مشہور تر
بود مرشدِ تفتہ، از بست سال — نہ رفت از دل و دیدہ در ہیچ حال
رقم ہرچہ زد، اول او را نمود — ازاں پس بہ اہلِ جہاں وانمود
نمود ایں خضر گوئی از التفات — بہ گم کردہ رہ، راہ آبِ حیات
صفاتش فزوں از بیانست و بس — نہ من، صد چو من بے زبانست بس

یہاں تفتہ مرزا غالب کی عقیدت کے نشہ میں سرشار نظر آتے ہیں اور ان کا ایک ایک لفظ عقیدت میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

تفتہ نے ابتدا میں مرزا قتیل سے مشورۂ سخن کیا۔ اس زمانے میں وہ راحتی تخلص کرتے تھے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ اور ۱۲۳۱ھ میں قتیل کی وفات پر منقطع ہو گیا۔ تعجب ہے مرزا قتیل سے تفتہ کے روابط کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔ صرف نصر اللہ خاں خویشگی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں : ؎

"... مولدش چکلۂ سکندر آباد در محلۂ قانون گویاں..."

تلمیذ مرزا قتیل است ۔"[۱]

صاحب گلشن ہمیشہ بہار کا یہ بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ خصوصیت سے اس لیے بھی کہ کوئی اور تذکرہ نگار اس پر روشنی نہیں ڈالتا۔ یہ زمانہ تفتہ کی ناپختہ کاری اور نومشقی کا ہے۔ قتیل کی وفات کے وقت تفتہ کی عمر ۱۸-۱۹ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک از خود ہی مشق سخن کرتے رہے اور اپنے ذوق کو پروان چڑھاتے رہے۔ قتیل کے بعد مرزا غالب سے ربط قائم ہونے سے قبل کسی اور استادِ فن سے مشورۂ سخن کرنے کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ غالب سے ان کے روابط قتیل کے انتقال کے کافی عرصہ کے بعد قائم ہوئے۔

تفتہ مرزا غالب کی شاگردی کے رشتہ میں کب منسلک ہوئے اس کا تعین مشکل ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اس طرف کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ جناب مالک رام نے بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا اور صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کر گئے:

"ابتدا میں راقی تخلص کرتے تھے۔ حسین قلی خاں نے اپنے تذکرے (نشترِ عشق) میں لکھا ہے کہ نور العین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا۔"[۲]

اور

"جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو انھوں نے تخلص بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر مرزا تفتہ بنا دیا۔"[۳]

لیکن غالب کی شاگردی اختیار کرنے کے زمانے کا تعین نہیں کیا۔ غلام رسول مہر نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور سلسلۂ تلمذ قائم ہونے

---

[۱] گلشن ہمیشہ بہار ۔ ص ۹۹ [۲] تلامذۂ غالب ۔ ص ۶۴
[۳] ایضاً ۔ ص ۶۵

کے زمانے کے تعین کی کوشش کی۔ وہ لکھتے ہیں:

"غالب سے تلمذ کا سلسلہ کب شروع ہوا؟ اس بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ فارسی خطوں میں تفتہ کے نام ایک خط ہے۔ جو فروری ۱۸۴۸ء میں لکھا گیا۔ یعنی اس سے پیشتر تفتہ شاگرد بن چکے تھے۔" لہ

مولانا سے یہاں تسامح ہو گیا ہے۔ انھوں نے جس خط کا حوالہ دیا ہے وہ ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء کا ہے۔ مولانا نے ۱۸۴۸ء غلط تحریر کیا ہے۔ یہ خط "پنج آہنگ" میں شامل ہے۔ اور اس کے جتنے بھی ایڈیشن ملتے ہیں سب میں ۱۸۴۹ء واضح طور پر دیا گیا ہے۔ پھر محض اس خط کی بنا پر دونوں کے روابط کے آغاز کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ اس خط کی عبارت سے بھی اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اس کے علاوہ اُردو میں تفتہ کے نام مرزا غالب کے ۱۲۴ خطوط ملتے ہیں لیکن ان میں سے کسی خط میں بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے دونوں کے تعلقات کے آغاز کا پتہ چلایا جا سکے۔ البتہ تفتہ کے چند اشعار ایسے ملتے ہیں جو کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور بڑی حد تک اس مسئلہ کے حل کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ مثلاً غالب کے مرثیہ میں ایک جگہ کہتے ہیں۔ ؎

در من و او بہ یاری بختم
تا چہل سال ماند صحبت ما

غالب کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ تفتہ کہتے ہیں کہ مرزا غالب سے ان کے تعلقات چالیس سال تک رہے اس حساب سے ۱۸۲۸ء یا اوائل ۱۸۲۹ء تعلقات کے آغاز کا زمانہ قرار پاتا ہے۔ مگر اس کو یقینی نہیں بتایا

لہ خطوط غالب: مرتبہ غلام رسول مہر۔

جا سکتا اس لیے کہ یہ زمانہ غالب کے سفر کلکتہ کا ہے۔ وہ اگست ۱۸۲۶ء میں دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے اور تین سال سے کچھ زیادہ عرصہ حالتِ سفر میں گذارنے کے بعد ۲۸، نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس آئے۔ ظاہر ہے اس دوران تفتہ سے ان کا ربط قائم ہونا کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں۔ البتہ اتنا ممکن ہے کہ واپسی کے تھوڑے ہی عرصے بعد ربط قائم ہو گیا ہو۔ اس طرح یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تفتہ ۱۸۳۰ء میں مرزا غالب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کے مطبوعہ دیوان میں ایک طویل قطعہ ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

بود مرشد تفتہ از بست سال
نہ رفت از دل و دیدہ دیہیچ حال

اس سے بھی مذکورہ بالا خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تفتہ ابتدا میں راقی تخلص کرتے تھے۔ "تذکرہ روز روشن" میں ان کا ذکر راقی کے تحت ہی ملتا ہے اور ایسے ہی کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے جو راقی کے تحت کہا گیا تھا۔ اس کی عبارت ہے:

"منشی ہرگوپال ولد موتی لال قوم کایتھ متوطن سکندر آباد مضافات بضلع بلند شہر کہ در صبح گلشن بہ تخلص تفتہ و قوم برہمن مذکور ..... دریں مقام سخنان ابتدائی او کہ بتخلص راقی موزوں کردہ از نشتر عشق چیدہ برائی تفنن ناظرین ثبت گردیدہ۔"[1]

مرزا غالب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے شفیق استاد کے ایما پر تخلص تبدیل کر کے تفتہ کر لیا اور پھر کبھی

---

[1] روز روشن۔ ص ۲۳۶۔۲۳۷

راقمؔ کو استعمال نہ کیا۔ اور اس تخلص ہی سے اتنے مشہور ہوئے کہ اب عام طور پر لوگ ان کے راقمؔ تخلص سے واقف ہی نہیں۔ دراصل یہ تبدیلی تخلص اپنے استاد محترم کی قائم کردہ روایت کا اتباع تھا۔ غالب ابتدا میں اسدؔ تخلص کرتے تھے مگر کچھ ہی عرصہ بعد اس کو ترک کر کے اسد اللہ غالبؔ بن گئے تھے۔ غالبؔ نے ان کا تخلص ہی نہیں بدلا بلکہ مرزا کا لقب بھی عطا کیا۔ اس طرح وہ غالب کی صحبت اختیار کر کے منشی ہرگوپال کھتّا گر راقمؔ سے 'مرزا ہرگوپال تفتہؔ' ہو گئے۔ غالب انھیں عام طور پر 'مرزا تفتہ' سے مخاطب کرتے تھے۔

غالب تفتہ سے بہت محبت کرتے تھے جس کا اظہار تفتہ کے نام ان کے خطوط سے ہوتا ہے۔ ان خطوط میں وہ تمام روایتی تکلفات سے بالاتر ہو کر انتہائی بے تکلفی کا طرز اختیار کرتے ہیں جس سے ان کے قلبی تعلق کا سراغ ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری نظر سب سے پہلے القاب پر پڑتی ہے۔ غالب کی خطوط نگاری کی یہ اہم ترین خصوصیت ہے کہ وہ حتی المقدور فرسودہ اور طول طویل القاب و آداب سے احتراز کرتے ہیں۔ اور ندرت اور اختصار سے کام لیتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ مکتوب الیہ کے مرتبہ کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ اپنے بے تکلف احباب اور شاگردوں کے نام خطوط میں ان کے القاب بے تکلفی اور سادگی کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کے ایک ایک لقب سے اخلاص اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ تفتہ غالبؔ کے چہیتے شاگرد تھے لہٰذا ان کے نام خطوط میں ایسے ہی القاب استعمال کئے ہیں جن سے ان کا قلبی تعلق، شفقت، اخلاص اور بے تکلفی کا اظہار ہوتا ہے۔ چند القاب ملاحظہ ہوں:

کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ	مہاراج	بھائی
برخوردار	جانِ من و جانانِ من	میرزا تفتہ

میاں۔ نورِ نظر، لختِ جگر، منشی صاحب

ان کے علاوہ محض شفقت، بے تکلفی اور ظرافت کا اظہار کرتے ہوئے اکثر ایسے القاب بھی استعمال کرتے ہیں جو بزرگوں اور قابلِ احترام شخصیتوں کو لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت مشفق میرے، کرم فرما میرے، صاحب بندہ، بندہ پرور، وغیرہ۔

تفتہ کے نام خطوط میں غالب اپنی فطری شوخی و ظرافت کا مظاہرہ بڑے یگانگت کے انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں؛

"دیکھو صاحب، یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے لطف اس میں یہ ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ نے مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لینے میں کچھ تکلف سے کام لیا اور ان کو لکھا کہ اصلاح کرنے میں آپ کو زحمت ہوتی ہو گی اور آپ یقیناً اس کام سے گھبراتے ہوں گے۔ اس کے جواب میں غالب نے انتہائی مشفقانہ لہجے میں تحریر کیا کہ اپنی اولاد کی حرکتوں سے کون گھبراتا ہے۔ تمہارے اشعار میرے معنوی پوتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان سے کیوں گھبراؤں گا۔ وہ لکھتے ہیں؛

"دوستو صاحب، یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے، کہ وہ میرے پوتے ہوتے ہیں۔ میرے پاس آ رہے ہیں، اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ پس، تمہارے نتائجِ طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالمِ صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں

میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں نہیں تنگ آتا، تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا۔ آپ ان کو جلد میرے پاس بسبیل ڈاک بھیج دیجئے کہ میں ان کو دیکھوں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر ان کو تمہارے پاس بہ سبیل ڈاک بھیج دوں گا۔"

غالب کو تفتہ سے بڑی انسیت تھی۔ اور عالم یہ تھا کہ اگر کبھی تفتہ کی طرف سے خط آنے میں تاخیر ہو جاتی تو غالب پریشان ہو جاتے اور ان سے خط بھیجنے کا تقاضہ کرتے۔ ایک بار تفتہ کی جانب سے تساہل کا اظہار ہوا اور کوئی ایک ماہ تک خط نہیں آیا۔ اس پر غالب نے انہیں بڑے حسرت بھرے لہجے میں تحریر کیا :

"کیوں صاحب، مجھ سے خفا ہو! آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا. یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا، کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا۔ یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گذر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط کی موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں کے خط کے آنے کی توقع۔ اس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ہاں، ایک تم کہ ہر مہینہ میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔ سنو صاحب، اپنے پر لازم کر لو، ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کام آپڑا دو تین خط ورنہ امن خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔"

اسی طرح ایک اور موقع پر جب تفتہ کی طرف سے خط میں تاخیر ہوئی تو غالب اس کا تقاضہ اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں :

"کیوں صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں ؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے ۔"

ایک اور مرتبہ جب تفتہ کی طرف سے غیر معمولی کوتاہ قلمی کا اظہار ہوا تو غالب بے چین ہو اٹھے :

"کیوں صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی ؟ اور اگر کسی طرح تمہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو. میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں. یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا . . . دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے. خط لکھو صاحب نہ لکھنے کی وجہ لکھو. آدھ آنے میں بخل نہ کرو. ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو ۔"

۱۸۵۸ء میں غالب کی تصنیف "دستنبو" شائع ہوئی یہ ان کی معرکتہ الآرا تصانیف میں شامل ہے. اس میں انھوں نے ۱۵ ماہ یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء کے ہنگامے کے دوران دہلی کی روئداد اور اپنی سرگذشت ٹکسالی فارسی زبان میں تحریر کی ہے اور اس بات کا التزام کیا ہے کہ اس میں عربی زبان کا کوئی لفظ شامل نہ ہونے پائے. مگر اس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے. غالب نے اس کا مسودہ تفتہ کے پاس بھیج دیا تھا وہ اس زمانے میں آگرہ میں مقیم تھے. وہیں نبی بخش حقیر اور حاتم علی مہر جیسے غالب کے مخلص احباب اور منشی شیو نرائن آرام جیسے نیازمند بھی موجود

تھے۔ ان چاروں حضرات کی زیر نگرانی دستنبو کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلایق آگرہ سے شائع ہوا۔ مطبع کے مالک منشی شیو نرائن آرام خود بھی غالب کے شاگرد تھے۔ ان کی خصوصی توجہ سے اس کی اشاعت بڑے قرینہ سے ہوئی۔ غالب کو اس کی طباعت وغیرہ بہت پسند آئی۔ مرزا تفتہ کو ایک خط میں اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"کل جمعہ کے دن ۱۲ تاریخ کو ۳۳ جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیو نرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا، سب خوب! دل خوش ہوا اور شیو نرائن کو دعا دی۔"

تفتہ کو غالب سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کا ایک ایک حرف اس سعادتمند شاگرد کے لیے بیش بہا دولت کی سی وقعت رکھتا تھا۔ اسی لیے وہ غالب کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک حرف کو محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ منشی شیو رائن آرام منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ، چودھری عبدالغفور سرور اور حاتم علی مہر جیسے نیازمندان غالب بھی اس سلسلہ میں تفتہ کے ہم نوا تھے۔ منشی ممتاز علی نے اس سلسلے میں تحریک شروع کی اور غالب سے ان خطوط کو شائع کرنے کی اجازت چاہی۔ اسکے بعد شیو نراین آرام نے کوشش کی لیکن غالب انکی اشاعت کیلئے رضامند نہیں ہوئے مگر شیو نراین آرام اور تفتہ کا اصرار بڑھتا گیا لیکن غالب انکو پیہم انکار ہی کرتے رہے اس سلسلے میں شیو نرائن آرام کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"رقعوں کے چھاپے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں۔ البتہ اس باب میں میری راے پر تم کو اور تفتہ کو عمل کرنا ضروری ہے۔"

اسی دوران تفتہ کا اصرار اور بڑھا اور غالب سے ضد کی جس کے جواب میں غالب ان کو انتہائی شفقت بھرے انداز میں اس ارادے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں :

"رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں

کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے۔"

غالبؔ کو اپنے اُردو مکاتیب شائع کرانے میں تامّل اس لیے تھا کہ وہ ان کو معیاری نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو یہ گمان تھا کہ ان کے فارسی رقعات کے سامنے بالکل پھیکے اور بے مزا معلوم ہوں گے اور اس طرح ان کی عظمت پر حرف آجائے گا۔ اس وہم کا سبب یہ تھا کہ اُردو میں انھوں نے کوئی خط کاوش کر کے اور غور و فکر سے نہیں لکھا تھا بلکہ قلم برداشتہ اور سرسری طور پر لکھا تھا۔ لہٰذا ان کا یہ خیال تھا کہ ان میں وہ ادبی شان پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ جو ان کے فارسی رقعات کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے منشی شیو نرائن آرامؔ کے نام مندرجہ ذیل خط میں کیا ہے:-

"اُردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں؟ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔"

لیکن غالب کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم ان کے معتقدین نے ان کے مکاتیب شائع کر دیے۔ پہلے غالب کی حیات میں ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے 'عودِ ہندی' کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ء میں ان کے انتقال کے تقریباً ایک ماہ بعد ان کے خطوط کا دوسرا مجموعہ 'اُردوئے معلّٰی' (حصہ اول) شائع ہوا۔ اور ۱۸۹۹ء میں مولانا حالیؔ کی نگرانی میں مطبع مجتبائی دہلی سے اُردوئے معلّٰی کے حصہ اول و دوم یک جا طور پر شائع ہوئے اور لوگوں نے دیکھا کہ جن خطوط کو غالب غیر معیاری اور شکوہ کا سد

سمجھتے تھے وہی اعلیٰ معیاری اور سکۂ رائج الوقت ثابت ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خطوط میں غالب کے فارسی رقعات کی سی نکتہ رسی، معنی آفرینی اور شوخی و ظرافت کے دلآویز مرقعے نظر نہیں آتے لیکن ان میں ایسی سادگی روانی، بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے جس نے ان کو فطری حسن سے مزین کر دیا ہے۔ اور آج غالب کی شہرت کی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے ان میں اردو خطوط کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ غالب کو اپنے اردو خطوط کی اہمیت اور معیار کا احساس ہو گیا تھا اور اپنے نیازمندوں کے اصرار پر خطوط کی اشاعت کے لیے رضامند ہو گئے تھے۔ چنانچہ نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بہ سبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہو گا۔"

یہ وہی کام ہے جس کی شیو نراین آرام اور میرزا تفتہ کو سختی سے ممانعت کر چکے تھے۔ اور اب نہ صرف اس کے لیے رضامند ہو گئے تھے بلکہ ان کی یہ شدید خواہش بھی ہو گئی تھی کہ یہ چھپ کر جلد از جلد منظر عام پر آ جائیں۔
تفتہ مرزا غالب کو اپنا مشفق اور بزرگ سمجھتے تھے۔ اسی لحاظ سے ان کو غالب سے گہری عقیدت ہو گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے شفیق

استاد کی خدمت ہی میں بسر کرنا چاہتے تھے۔ غالب ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور تقریباً دو ماہ وہاں مقیم رہے۔ اسی دوران تفتہ نے مرزا غالب سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انھیں بھی رام پور بلا لیں۔ اس کا مقصد ایک طرف تو یہ تھا کہ غالب کے توسط سے ریاست میں ملازمت مل جائے یا وظیفہ مقرر ہو جائے اور دوسری طرف ان کا مقصد غالب کی خدمت میں رہ کر ان کی صحبت سے فیض یاب ہونے رہنا تھا۔ غالب نے انہیں جواب دیا کہ اگر میرا قیام یہاں مستقل ہو گیا تو بلا لوں گا۔ وہ کہتے ہیں:

"دوسری بات جو تم نے لکھی ہے وہ بھی مطابق واقعہ و مناسب حال نہیں اگر اقامت قرار پائی تو تم کو بلا لوں گا۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اس جواب سے تفتہ مطمئن نہیں ہوئے اور یہ سمجھے کہ غالب انھیں رام پور بلانا نہیں چاہتے۔ اس شبہہ کا اظہار انھوں نے ایک خط میں کیا بھی جس کے جواب میں غالب نے انھیں ان الفاظ میں سمجھایا:

"آخر لڑکے ہو بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ بہ شرطِ اقامت بلا لوں گا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر اقامت یہاں کی ٹھہری تو بے تمھارے نہ رہوں گا۔ نہ رہوں گا۔ زنہار نہ رہوں گا۔"

غالب اس چہیتے شاگرد کو فی الواقع اپنے پاس بلا لینا چاہتے تھے۔ انھیں ہمہ وقت اس کی فکر تھی لاحق تھی۔ لیکن حالات سازگار نہ ہوئے اور وہ اپنے اس ارادے کو عملی شکل نہ دے سکے۔ دراصل وہ یہ چاہتے رہے کہ غیر یقینی صورت حال ختم ہو اور مستقل قیام کی صورت پیدا ہو جائے تو مرزا تفتہ کو اپنے پاس بلا لیں۔ چنانچہ ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"اس سے آگے تم کو حالات مجمل لکھ چکا ہوں۔ ہنوز کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ بالفعل نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر مراد آباد اور

وہاں سے رام پور آ جائیں گے۔ بعد ان کے جانے کے کوئی طور اقامت
یا عدم اقامت کا ٹھہرے گا۔ منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا
ہوا تو فوراً تم کو بلا لوں گا۔ جو دن زندگی کے باقی ہیں وہ باہم
بسر ہو جائیں۔"

لیکن حالات کچھ اس نوعیت کے بنے کہ غالب کو مستقلاً رام پور میں رہنا
نصیب نہ ہوا اور ڈیڑھ ماہ سے کچھ زائد قیام کر کے ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء کو
دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس طرح تفتہ کا رام پور جا کر مرزا غالب کے ساتھ
قیام کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

غالب کو تفتہ سے بڑی محبت تھی اور ان سے تعلقات کو غالب اپنے لیے
باعثِ فخر سمجھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذاللہ، تم
سے اور آزردگی! مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں
ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال، نام اور
تفتہ تخلص ہے۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو
رہا غماز کا کہنا، اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی گل ایک تھا
وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مرگیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار
ہوتا اور تمہاری برائی کہتا، تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس
سے آزردہ ہوتا۔"

غالب کے تعلقات اپنے شاگردوں سے ہمیشہ اچھے رہے۔ غالب ان
کے ساتھ شفقت اور بزرگی سے پیش آتے۔ اور ان کی دل جوئی کرنے
انھوں نے کبھی ان کے کلام پر اصلاح دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ اور نہ
ہی کبھی غیر معمولی تاخیر سے کام لیا۔ اسی طرح وہ اپنے احباب کے ساتھ بھی خلوص
سے پیش آتے اور حتی المقدور ان کی بھی تالیف قلوب کرتے۔ یہی سبب ہے

کہ ان کے احباب اور تلامذہ اُن پر جان نثار کرتے تھے۔ اور آڑے وقت میں اُنکے کام آتے تھے۔ اور حسبِ استطاعت ان کی معاشی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان خدمت کرنے والوں میں تفتہ بھی پیش پیش رہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ان کی امداد کرتے رہتے جس کی طرف اشارے ان کے نام غالب کے اکثر خطوط میں ملتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں غالب کی مالی پریشانیاں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھیں۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے تھے لیکن اخراجات کی وہی رفتار برقرار تھی۔ حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان کا مسلم حلقہ خود ابتلا میں گرفتار تھا اس لیے اس کی طرف سے امداد کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ ایسے موقع پر ان کے غیر مسلم احباب و شاگرد کام آئے جس سے مرزا غالب اپنے کاروبارِ زیست کو جاری رکھ سکے۔ جناب مالک رام رقمطراز ہیں:٥

"یہ ایام میرزا پر بھی نہایت مصیبت کے گذرے، آمدنی بالکل مفقود اور خرچ بدستور۔ بارے ان کے بعض ہندو دوستوں نے اس زمانے میں ان کی خبرگیری کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ میرٹھ سے روپیہ بھیجا کئے لالہ مہیش داس شراب مہیا کرتے رہے۔ ان کے علاوہ منشی ہیرا سنگھ درد، پنڈت شیو جی رام اور ان کے لڑکے بال مکند نے بھی حتی الوسع ان کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا نے خود دستنبو میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں نے ان حضرات کا ذکر اس لیے کیا کہ جہاں ان کی عنایتوں کا شکر یہ مجھ پر واجب تھا، وہیں میں چاہتا ہوں کہ میرے دوستوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ میرے جیسا کثیر الاحباب شخص اس زمانے میں کیسے بسر کرتا رہا۔ اگر شہر میں یہ چاروں صاحب بھی موجود نہ ہوتے تو کوئی میری بے کسی کا گواہ تک نہ ہوتا۔"

---

٥ ذکر غالب۔ ص ۹۴

تفتہ کے کلام پر اصلاح

غالب کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کے تلامذہ ہندستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کثرت کی سب سے بڑی وجہ غالب کی وسعتِ اخلاق اور وسیع المشربی تھی۔ اسی لیے ان کے نیازمندوں اور شاگردوں کے حلقے میں ہر مذہب و ملت اور ہر مسلک کے افراد شامل تھے۔ اس میں کسی مخصوص طبقہ یا گروپ کی کبھی تخصیص نہیں تھی۔ ان میں سلاطین بھی شامل تھے، نوابین بھی، شاہزادے بھی تھے اور ایسے افراد بھی جن کا شمار عوام میں ہوتا تھا۔ غالب ان سب کے ساتھ یکساں طور پر شفقت اور مہربانی سے پیش آتے، ان سب کے کلام پر اصلاح کا التزام کرتے اور اگر کبھی ایسا ہوا کہ علالت یا کسی دوسرے سبب سے اصلاح کا کام وقت پر نہ کر پاتے تو اس کا عذر کر کے مسودہ واپس نہ کرتے بلکہ اسے اپنے پاس محفوظ رکھتے اور حالات سازگار ہوتے پر اصلاح کر دیتے تھے۔ اور شاگردوں کو مایوس نہ کرتے۔

اصلاح سے متعلق غالب کے چند اصول تھے۔ جن پر وہ خود سختی سے پابند رہتے اور شاگرد کو بھی ان پر سختی سے کاربند رہنا پڑتا جو اصلاح کی غرض سے ان کی خدمت میں اپنا کلام بھیجتا۔ ان کی سب کو یکساں طور پر پابندی کرنی پڑتی اور شہنشاہ شہزادہ، نواب یا عام آدمی غرض کسی کو بھی چھوٹ نہیں تھی۔ غالب کی عام ہدایت تھی کہ بغرض اصلاح جو کلام ان کے پاس بھیجا جائے، اس کی تحریر صاف، روشن اور خوشخط ہو تاکہ اس کو پڑھنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ اشعار کھلے کھلے لکھے جائیں اور اشعار اور مصرعوں کے درمیان کافی جگہ ہو جس سے اصلاح شدہ عبارت،

گنجلک نہ ہو جائے اور شاگرد کو اصلاح کے سمجھنے میں مشکل پیش نہ آئے تمام شاگردوں پر ان قواعد کی پابندی ضروری تھی۔

غالب اصلاح میں خاصے محتاط تھے۔ ان کی اصلاح محض برائے اصلاح نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے پیچھے مضمون کی ترقی اور معیار کی بلندی کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔ انھوں نے کبھی ایسی اصلاح نہیں کی جس سے شاعر کا اصل اور بنیادی مفہوم ہی بدل جائے بلکہ وہ خود کو اسی مفہوم کے دائرے میں رکھتے ہوئے اس انداز سے اصلاح کرتے تھے کہ محاورہ اور زبان میں بہتری پیدا ہو جائے اور غریب لفظ کی جگہ اعلیٰ اور معیاری لفظ آجائے تاکہ شعر میں ہمہ جہتی ترقی ہو جائے اور شاعر کا بنیادی تخیل برقرار رہے۔ بالعموم دیگر اساتذہ کی طرح وہ شاگردوں کی طرف سے خود شعر کہہ کر بھی شامل نہیں کرتے تھے نہ ہی اپنے خارج شدہ اشعار شاگردوں کو دیا کرتے تھے۔ یہ ان کا خصوصی وصف تھا۔ جو شعر ان کو پسند آتا اس کی تعریف کرتے اور جو اصلاح دیتے اس کی توجیہ بھی کر دیتے تاکہ ایک طرف تو شاگرد کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور دوسری طرف جو اصلاح کی گئی ہے اس کی نزاکت کا علم ہو جائے۔ اس طرح ان کے شاگردوں پر اصلاح کی ضرورت اور اس کی خصوصیات واضح ہو جاتیں۔ اس طرز اصلاح کی بدولت ان کے شاگردوں کو خطوط کے ذریعہ اصلاح لینے میں وہی لطف حاصل ہوتا جو بالمشافہ گفتگو سے اصلاح لینے میں حاصل ہوتا۔ گویا مراسلہ میں مکالمہ کی خصوصیت ان کی اصلاح میں بھی جلوہ گر رہتی۔ شاگردوں کے نام غالب کے وہ خطوط جن میں ان کے کلام پر اصلاحیں ملتی ہیں شاہکار ادب پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں غالب نے زبان و ادب کے جو نکات حل کیے ہیں وہ ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں غالب کے سب سے زیادہ خطوط مرزا تفتہ کے نام ملتے ہیں۔ قدرتی طور پر ان میں ایسے خطوط کی تعداد بھی کافی ہے جن میں تفتہ کے کلام پر اصلاحیں ملتی ہیں۔ ان خطوط میں

تفتہ کے کلام کی توصیف بھی ہے۔ غلطیوں پر تنبیہ بھی، اصلاح بھی ہے اور اصلاح کی توضیح بھی۔ اس طرح یہ خطوط محض نجی رقعات کی حدود سے تجاوز کر کے اقلیم فن و بیان کی سرحدوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور ادبی شاہپاروں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ مثلاً ایک خط میں تفتہ کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"...... تمہاری خوشامد نہیں کرتا۔ سچ کہتا ہوں ... [illegible] ہمارے کلام کی تحسین کرتے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔"

ایک خط میں ان کے قصیدہ کی تعریف کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اس کے چند نکات بھی بیان کیے ہیں:

"ہزار آفریں! کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ وا چشم بد دور تسلسل معنی، سلاست الفاظ! ایک مصرع میں تم کو محمد اسحٰق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا، وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے ع۔

چاک گر دیدم داز جیب بہ داماں رفتم

پہلا مصرع تمہارا اگر اس کے مصرع سے اچھا ہوتا تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔ خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان میں تیرہ و کا قصائد کا کہہ لو۔ مگر خبردار، قصائد بہ قیدِ حروف تہجی نہ جمع کرتا۔"

ایک خط میں تفتہ کی غلطی کی طرف اشارہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"یہ غلطی تمہارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباحت یہ ہے کہ "اعم" بہ تشدید لفظ عربی ہے ع

"دیگر نتواں گفت اخص را کہ اعم است"

مگر بحر ادا ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی تو یسان عجم نے یوں بھی

لکھا ہو۔ کاف نے استفاط کی کیا توجیہ کروگے؟ اور پھر اس صورت
میں بھی تو بحر بدل جاتی ہے۔ ناچار اس شعر کو نکال ڈالو۔"
ایک اور قصیدہ کی اصلاح کے سلسلہ میں یوں نکتہ آفرینی کرتے ہیں:
"مرزا تفتہ صاحب اس قصیدہ کے باب میں بہت باتیں آپ
کی خدمت میں عرض کرنی ہیں:
پہلے تو یہ کہ "خنجر را" و "گوہر را" کو تم نے از قسم تنافر سمجھا۔
اور اس پر اشعار اساتذہ سند لائے۔ یہ خدشہ تمہیں پیدا ہوتا
مگر لڑکوں کے اور مبتدیوں کے دل میں۔ سلیم ؎
شراب نقل نخواہد، بگیر ساغر را   کہ احتیاج شکر نیست شیر مادر را
یہ غزل شاہ جہاں کے عہد کی طرحی ہے۔ صائب و قدسی و شعرائے
ہند نے اس پر غزلیں لکھی ہیں۔
دوسرے یہ کہ ممدوح کا پورا نام بے تکلف آتے ہوئے خالی
کیوں اڑادو؟ ضیاء الدین احمد خان نام ہے، ہندی میں
رخشاں تخلص، فارسی میں نیّر تخلص ہے۔
ہمانا نیّر رخشاں ضیاء الدین احمد خاں
دیکھو تو کیا پاکیزہ مصرع ہے! یہ نہ کہنا کہ شعرا ممدوح کا نام
ننگا لکھ جاتے ہیں۔ وہ بحسب ضرورتِ شعر ہے۔ جس بحر میں
پورا نام نہ آئے اس میں شوق سے لکھو جائز اور روا مستحسن
جس بحر میں نام ممدوح کا درست آئے اس میں فروگذاشت
کیوں کرو۔"
ایک خط میں یائے تحتانی کے اقسام، اس سے مختلف انداز کے مرکبات اور محل
استعمال سے بحث کی ہے اور زبان دانی اور تحقیقِ حروف کے دریا بہائے ہیں۔
"دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی "بلبش" و "بیشتر" کا

قصہ نکالا۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو یائے
تحتانی تین طرح پر ہے۔
(الف) جزوِ کلمہ:

(مصرع) بما سے بر سر مرغاں از آں شرف دارد
(مصرع) اے سرِ نامہ نام تو عقل گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے، جزوِ کلمہ
ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔
دوسری تحتانیِ مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں
بھی مخل ہے، جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی
بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے تو شوم،
" رہنمائے تو شوم" یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔
تیسری دو طرح پر ہے: یائے مصدری اور وہ معروف ہو گی۔ دوسری طرح:
توحید و تنکیر۔ وہ مجہول ہو گی۔ مثلاً مصدری: "آشنائی"۔ یہاں
ہمزہ ضرور۔ بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: آشنائے
یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے دانا
نہ کہاؤ گے۔"

اسی طرح لفظ "نیم" کے معنی، اس کے محلِ استعمال اور اس سے مرکبات کے بارے
میں تحقیق کا جادو جگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نیم گناہ"، "نیم نگاہ"، "نیم ناز"، یہ روزمرّہ اہلِ زبان
ہے۔ نیم بہ معنی "اندک" ورنہ گناہ کا آدھا، اور "نگاہ کی ادھوڑ"
اور "ناز آدھا"۔ یہ مہملات میں ہے۔ ان چیزوں کا مناقشہ کیا؟"

اس کے علاوہ متعدد خطوط میں انھوں نے لسانی مسائل کی طرف اشارے کیے
ہیں اور لفظ و معانی کے نکات حل کیے ہیں۔ ایک خط میں اس طرح گوہر افشانی

کرتے ہیں:

"'خالقِ معنی'، بہ معنی 'معنی آفریں'، صحیح اور مسلّم اور جائز۔ لیکن جس طرح 'اللہ' میں مشدد لام کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے 'الا'، الہیٰ میں الف ممدودہ کو دوسرا الف کیونکر سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا۔ اتفاقِ سلف شرط ہے۔ 'الہیٰ' میں جب اور کسی نے دو الف نہیں مانے تو ہم کیونکر مانیں۔

دویم 'بر وزن 'جویم' غلط۔ 'دوم' ہے بغیر تحتانی۔ بالفرض تحتانی بھی لکھیں تو 'دُیَم' پڑھیں گے اگرچہ لکھیں گے دویم۔ واو کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں 'دوی' درست ہے مگر نہ بہ حذفِ تحتانی مثل 'زمی' بہ حذفِ نون۔ بلکہ بہ طریق قلبِ بعض دویم کا 'دوی' ہو گیا ہے۔"

ایک خط میں قافیہ کی نزاکتیں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"اس غزل میں 'پروانہ' و 'پیمانہ' و 'بت خانہ' تین قافیے اصلی ہیں۔ 'دیوانہ' چونکہ عَلَم قرار پاکر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے اس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی غلامانہ و مستانہ و مردانہ و ترکانہ، و 'دلیرانہ' و 'شکرانہ' سب ناجائز و نامستحسن ایطا اور ایطا بھی قبیح۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایطا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں اور پھر تم نے غزل مبنی انھیں قوافی پر رکھی۔ کاشانہ و شانہ و افسانہ و جانانہ و فرزانہ یہ قافیے کیوں ترک کیے؟ یاد رہے ساری غزل میں 'مردانہ' یا 'مستانہ' یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔۔۔"

تفتہ کی طرح دوسرے شاگردوں کے نام بھی مرزا غالب کے ایسے سیکڑوں خطوط ہیں جن میں تنقیدی اور تحقیقی اشارے ملتے ہیں جن سے زبان وادب کے مختلف مسائل اور معائب ومحاسنِ سخن کی نزاکتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے علاوہ زبان، املا، الفاظ، ان کے معانی ومحل استعمال اور ردیف وقوافی کی باریکیاں جیسے اہم مسائل سے بھی بحثیں ملتی ہیں۔ اس طرح ان خطوط کی ادبی حیثیت کے علاوہ تنقیدی اور تحقیقی، اہمیت بھی ہو جاتی ہے۔

تفتہ تذکرہ نگاروں کی نظر میں

(۱) گلشن ہمیشہ بہار، مؤلفہ نصر اللہ خاں خویشگی [تالیف ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء]
مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۔ ۱۹۶۷ء

تفتہ تخلص ۔ ہرگوپال نام از قوم کایستھ بھٹناگر است ۔ مولدش چکلہ سکندرآباد در محلہ قانون گویاں، تلمیذ مرزا افیتال است ۔ گویند مردے آزاد طبع است و لطیف مزاج ۔ چندے بہ تحصیل داری کاشی پور کٹھاگر دوارہ ضلع مراد آباد در عمال ملازم بود ۔ حالا شنیدہ ام کہ بہ تخفیف در آمدہ ۔ معلوم ندارم کہ دریں وقت کدام کجاست ۔ طبع خوش دارد و نکات موزوں در ہندی و فارسی می آرد ۔ مطلع دیوان فارسی او این است ؎

آب دگر افزود کسے نوک سناں را
اقبال بلند است شہادت طلباں را

(۲) گلستانِ سخن ۔ مؤلفہ مرزا قادر بخش صابر [تالیف ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء]
مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۔ ۱۹۶۶ء

تفتہ تخلص منشی ہرگوپال متوطن سکندرآباد ۔ عہد طفولیت سے سخن گوئی کی طرف مائل ہے ۔ سنا گیا کہ اشعار فارسی سے دیوان ضخیم فراہم کیا ہے ۔ راقم آثم تک سوا اس ایک شعر کے نہیں پہنچا ۔ اگر یہی طرزِ گفتگو ہے تو نہایت خوش فکر ہے ؎

اے نالہ سوی چرخ مرو گرم مرو
با پیر نہ زیبد سرِ آزار جواں را

(۲) صبح گلشن : مؤلفہ سید علی حسن خان۔ [تالیف ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء]
مطبوعہ : مطبع شاہجہانی ۔ بھوپال ۱۲۹۵ھ

منشی ہرگوپال از قوم برہمن متوطن اضلاع شاہجہان آباد و از ارشد تلامذۂ میرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی والانژاد ست۔ باتشِ عشق غزلان غزل تفتہ جگر و تبلاش مضامین برشتہ در ساحت خیال گرم ترجیلی پرگو ست۔ کلام منظومش بسیار۔ پنج دیوانِ شعر دارد۔ ابیات ہر یکے ازاں قریب سیزدہ ہزار ہے

رہا ند از چنیں بیدانتہایت خدائے دل! بدانش افتی و دیگر طمع داری رہائی را
کوچہ کردیہائی مارا اے کہ پرسی ماحصل آفتاب آید خطاب از غیب رسوائی ترا
بدنجتیم زخویش نہ تنہا بردمرا خواب ار شوم زچشم تو شبہا بریمرا
چند گوئی کہ نشاں نیست زخونیں کفناں مگر ایں لالہ کہ بینی زشہیدان تو نیست
دردی کہ جانِ ما بلب آورد دوائے ماست مرگے کہ رمد بما تماید شفائی ماست
تیغ افتاد از کفِ قاتل زندگانی و بالِ گردن کیست
میبرد و چار سو نمیدانم برق گرمِ تلاشِ خرمن کیست
حسرت ہلاکِ بیکسی آں کہ بردرت با جانِ خستہ آمد و با چشمِ تر گذشت
منزلِ غم دل فگارِ من ست عیش صد فرسخ از دیارِ من ستا
مرگ اسیران را رہائی میدہد مژدۂ مشکل کشائی میدہد
سالکان تفتہ جان تنہا نہ محمل سوختند راہ را در آتش افگندند و منزل سوختند
عاشقاں گرمِ تماشا چوں شدند از فرطِ شوق ہر کجا معشوق دیدند آنچہ حائل سوختند
بگذر از دیوانگان خود کہ ایں آتش دماں طوق را کردند خاکستر سلاسل سوختند
حالِ باغ از من مپرس اے محفل پیش تو گرم لالہ ہائے تو برنگِ شمع محفل سوختند
مشربیم بگرد بزہد و اتقا آتش فگن تفتہ با حق ساختند آنانکہ باطل سوختند
اے تماشا گاہِ ایں دل بروئے تو عالمی در دل تماشا کردہ ایم

ما نہ تنہا دیدہ پرنم کردہ ایم | آنچہ نتواں کرد آنہم کردہ ایم
دارد از خود رفتگی ہا عالمی | رفتہ ایم و سیر عالم کردہ ایم
آفتاب بختش آمد در کسوف | گریہ ہا بر حالِ شبنم کردہ ایم

اے زخم بو سمت، لبِ خندانِ کیستی | اے داغ بو میت، گلِ بستانِ کیستی

ایں نمی خواہم نسیم باغم اے دلبر شوے | بر چراغ مدعای مدعی صرصر شوے
خوش دم صبح و دعا را نیز اثر ایں دم مرا | گرچشانی قطرۂ مے ساقیِ کوثر شوے

(۴) روز روشن: مؤلفہ مظفر حسین صبا [تالیف ۱۲۹۵-۹۶ھ / ۷۹-۱۸۷۸ء]
مطبوعہ: مطبع شاہجہانی۔ بھوپال، ۱۲۹۷ھ

راقیؔ۔ منشی ہرگوپال ولد موتی لال قوم کایتھ متوطن سکندرآباد مضافات بضلع بلندشہر کہ در صبح گلشن بہ تخلص تفتہ و قوم برہمن مذکور والحال وی بہ ہمیں تخلص مشتہر ست و در "نشتر عشق" نوشتہ کہ وی بفیض مطالعہ دیوان نورالعین واقفؔ بٹیالوی و تحریر تذکرہ نشتر عشق بر سخن سرای و نکتہ سنجی قادر گردیدہ۔ نامہ نگار می گوید کہ قادر توانا طرفہ ذکاوت و استعداد در طینتش ودیعت نہادہ کہ باندک توجہ در سرش سودای شاہدان نظم افتادہ لکن بعد ازاں کہ زانوی تلمذ بخدمت غالبؔ دہلوی نہ کردہ پہلو بہ پختہ کاران ایں فن زدہ و دواوین عدید برشتہ نظم کشیدہ اگر حسین قلی خان نشتر عشق تا ایں زمان زندہ بودی دفتری بمدحش تسوید نمودی دریں مقام سخنان ابتدائی او کہ بتخلص راقیؔ موزوں می کرد۔ از نشتر عشق چیدہ برای تفننِ ناظرین ثبت گردیدہ ؎

از خیالِ لب و دندانِ تو ای سیمین تن! | آب یاقوت و در از چشم تر افتاد مرا
راست گویم کز تماشای قدش | عالم بالا نظر آمد مرا
پشت بہ دیوار یار بنشست | کاشکے دیوار می بودیم ما
خراب و خستہ مرا یار دید و ہیچ نگفت | مگر ز غصہ لبِ خود گزید و ہیچ نگفت

زراٰئیِ تو چو ما سرگذشت پرسیدیم — کشیدہ آہ دگر یاں دریدیچ نگفت
بسکہ بالیدم بیادِ قدِ او — نالہ ام از عالمِ بالا گذشت
راٰئیِ تو کز غمت بیمار بود — عافیت امروز از دنیا گذشت
آہ بیمارم و عیسیٰ نفسی پیدا نیست — بر سرم جز ملک الموت کسے پیدا نیست
از و دیدہ ہای اشکِ خود بسے شادم بلی — طفل چوں رفتن بیاموز و پدر خوش دل شود
وقتِ نزعم چو یارم آمد — ہنگامِ خزاں بہارم آمد
دلبرِ من ببر نمی آید — مطلبم آہ بر نمی آید

اے وادی زخود خبر چگویم — از خود رفتم دگر چہ گویم
کشتۂ لعل تو ہستم ز آنرو — مدفنِ خویش یمن می خواہم
نامِ من مبتلا چہ پرسی — دیوانہ و دردمند و خوارم
نشین در خانہ ام جانانۂ من — دگر نہ می نشیند خانۂ من

(۵) خمخانۂ جاوید (جلد دوم)؛ مؤلفہ لالہ سری رام۔
مطبوعہ : دفتر خمخانۂ جاوید۔ دہلی، ۱۹۱۱ء

تفتہ ۔ سخنور ہم پایۂ طالب و کلیم منشی ہرگوپال صاحب تفتہ الملقب بہ میرزا تفتہ حضرت غالب مرحوم کے عزیز ترین اور ارشد ترین شاگرد تھے۔ فارسی کلام آپ کا اس پایہ کا ہوتا تھا۔ جسے سن کر اہل زبان ستایش کرتے تھے ہمیشہ فارسی کہتے رہے اردو کی طرف کبھی توجہ نہ ہوئی۔ ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور زیادہ حصہ عمر کا اپنے وطن سکندر آباد نواح دہلی میں گذار دیا۔ ۴ مجلد کلام فارسی میں جس میں ہزاروں غزلیں ظہوری، نظیری، صائب، حافظ، عرفی خسرو، جامی کی ہم طرح زمینوں میں ہیں ان سے یادگار ہیں۔ مرزا غالب کو ان سے دلی انس ہی نہ تھا بلکہ انھیں اپنا سرمایۂ نازش سمجھتے تھے اور ہمیشہ عزیز داری کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ مرزا تفتہ کا لقب انھیں نے عنایت کیا تھا "اردوئے معلّٰی" میں اکثر خطوط ان کے نام موجود ہیں۔ عالم ضعیفی میں مرزا کی

وفات کے دس برس بعد انتقال کیا۔ ان کے اُردو کلام میں صرف حضرت غالبؔ کی تاریخ وفات دستیاب ہوتی ہے جسے ہم تبرکاً درج ذیل کرتے ہیں ؎

غالبؔ وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے | ہم سے ہزار ہیچ مداں نامور ہوئے
فیض و کمال، صدق و صفا اور حسن و عشق | چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پا و سر ہوئے

---

(۶) تلامذۂ غالبؔ ؛ مؤلفہ مالک رام — مطبوعہ مرکز تصنیف و تالیف نکودر : ۱۹۵۷ء

دلّی سے ۴۰ — ۴۵ میل شمال کی طرف ایک اچھا خاصا قصبہ سکندرآباد (ضلع بلند شہر) ہے جسے سکندر لودھی (۱۴۸۹ء — ۱۵۱۷ء) نے بسایا تھا۔ اسی کے زمانے میں ایک کھٹناگر کایستھ خواجہ دیپ چند (خلف امر دیو) فیروز آباد (مضافات آگرہ) سے آ کے یہاں بس گئے۔ چنانچہ ان کے خاندان والوں کی آل آج تک "فیروز آبادی" ہے۔ اس خاندان کو ۵۴۰ بیگہ پختہ معافی اور عہدۂ قانون گوئی موروثی ملا تھا۔

خواجہ دیپ چند کی اولاد میں ایک صاحب موتی لال ہوتے ہیں۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے جن کی اولاد "اٹھ گھرے" کہلاتی ہے۔ منشی ہرگوپال انھیں موتی لال کے بیٹے تھے ۱۷۹۹ء — ۱۸۰۰ء (۱۲۱۴ھ) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق شروع سے تھا۔ انگریزی محکمہ بندوبست میں مدتوں قانون گو رہے لیکن شاعری کے شوق میں نوکری کو خیرباد کہہ دی ۱۸۵۰ء میں تھوڑے عرصے کے لیے ریاست جے پور میں بھی ملازمت کا تعلق ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کھکھیڑ بھی زیادہ دن تک نہ سہ سکے اور جلد ہی مستعفی ہو گئے کبرسنی میں ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء (۱۵ رمضان ۱۲۹۶ھ) کو سکندرآباد ہی میں وفات پائی۔ بدری کرشن فروغؔ نے تاریخ کہی ؎

ستمبر سنم با بعالم گذاشت | کہ از دہر سوئے جناں تفتہ رفت

دوم روز در دہر ماتم درچند   زجور فلک الاماں تفتہ رفت
سنِ عیسوی گفتم آخر فروغ   چہ سوئے جناں، زیں جہاں تفتہ رفت

(۱۸۶۹ء)

مولوی مختار احمد تھانوی نے ہجری میں تاریخ وفات لکھی ہے

سال نقلش با دل زار از خرد
من شنیدم بے سروپا شد سخن

(۱۲۹۵+۱ = ۱۲۹۶ھ)

اولاد میں دو لڑکے (امراؤ سنگھ اور پتمبر سنگھ) اور ایک لڑکی تھی۔ چھوٹا لڑکا پتمبر سنگھ ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) میں فوت ہوگیا اس کی وفات نے ان کی کمر توڑ دی۔ اسی موقع پر انہوں نے ۲۲ شعر کا وہ طویل مرثیہ لکھا تھا جو ان کے دیوان دوم میں موجود ہے۔ گلستاں کی تضمین بھی اس کی یادگار کے طور پر لکھی تھی جیسا کہ اس کے آغاز میں صراحت کی ہے۔ صاحبزادی کا بھی جلد ہی اس کے بعد انتقال ہوگیا۔ امراؤ سنگھ ان کے بعد زندہ رہے۔ انہوں نے "سنبلستان" کے آخر میں اسی صاحبزادے کی شکایت لکھی ہے۔ اس کی اولاد اس وقت سنگرور (ریاست جیند) میں موجود ہے۔

تفتہ ابتدا میں راقمؔ تخلص کرتے تھے حسین قلی خان نے اپنے تذکرے (نشتر عشق) میں لکھا ہے کہ نورالعین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا۔ چونکہ ذکاوت اور استعداد سے بہرۂ وافر ملا تھا۔ اس لیے تھوڑی سی توجہ اور مشق سے بہت جلدی ترقی کر گئے نشتر عشق میں جو انتخاب دیا ہے اس میں تخلص راقمؔ ہی ہے۔ مثلاً ؎

راقمؔ تو کز نعمت بیمار بود   عاقبت امروز از دنیا گذشت
ز راقمؔ تو چو ما سرگذشت پرسیدیم   کشید آہ و گریبان دریدہ ہیچ نگفت

جب غالبؔ کی شاگردی اختیار کی تو انھوں نے تخلص بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر "مرزا تفتہ" بنا دیا۔ تفتہ استاد کے محبوب شاگردوں میں سے تھے اور انھوں نے ان کی تہذیب و تحسین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ تفتہ نے تمام عمر فارسی میں بسر کر دی۔ اردو میں ان کے صرف اس ایک قطعہ کا پتہ چلتا ہے جو انھوں نے استاد کے انتقال پر کہا تھا۔

غالبؔ وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے — ہم سے ہزاروں ہیچ مداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق — چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پا و سر ہوئے

فارسی میں بہت بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ چار دیوان ہیں اور کسی میں بھی بارہ تیرہ ہزار شعر سے کم نہیں۔ سعدی کی گلستاں کی تضمین لکھی۔ ایک مثنوی "سنبلستان" بوستاں کے جواب میں لکھی۔ تمام مشہور اساتذہ فارسی کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں اور خوب خوب داد سخن دی ہے بلکہ تیسرا دیوان تمام تر خلاق معانی کمال اسماعیل اصفہانی کی طرحوں میں ہے اور کسی جگہ فارسیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اس تحریر سے بطور نمونہ چند شعر درج کرتا ہوں۔

رہا نداز چنیں بے دانشی ہا یت خدایے دل — بدانش افتی و دیگر طمع داری رہائی را
چند گوئی کہ نشاں نیست ز خونیں کفناں — مگر ایں لالہ کہ بینی ز شہیدان تو نیست
دردے کہ جان ما بلب آرد دوائے ماست — مرگے کہ رو نماید شفائے ماست
تیغ افتاد از کف قاتل — زندگانی و بال گردن کیست
می دود چار سو نمی دانم — برق گرم تلاش خرمن کیست
حسرت ہلاک بے کسی آں کہ بر درت — با جان خستہ آمد و با چشم تر گذشت
ایں اگر گویم کہ را آید یقیں — قصد جانم یار جانی می کند
دل کہ با مرگ آشنائی داشتہ ست — زندگانی جاودانی می کند
سالکان تفتہ جاں تنہا نہ منزل سوختند — راہ را در آتش افگندند و منزل سوختند

عاشقاں گرمِ تماشا چوں شدند از فرطِ شوق | بر رخِ معشوق دیدند آنچہ حائل سوختند
بگذر از دیوانگانِ خود کہ ایں آتش بجاں | طوق را کردند خاکستر سلاسل سوختند
حالِ باغ از من مپرس اے محفلِ عیش تو گرم | لالہ ہائے تو برنگِ شمعِ محفل سوختند
شر بہم گیرد بر بد و اتقا آتش فگن | تفتہؔ! با حق ساختند آناں کہ باطل سوختند

اے تماشا گاہِ ایں دل روئے تو | عالمے در دل تماشا کردہ ایم
ما نہ تنہا دیدہ پُرنم کردہ ایم | آنچہ نتواں کرد آں ہم کردہ ایم
دارد از خود رفتگی ہا عالمے | رفتہ ایم و سیرِ عالم کردہ ایم

---

(۷) بزمِ غالب ۔ مؤلفہ عبد الرؤف عروجؔ ۔
مطبوعہ ادارۂ یادگارِ غالب کراچی، ۱۹۶۹ء

ضلع بلند شہر کے ایک قصبہ سکندر آباد کو سکندر لودھی نے آباد کیا تھا۔ اسی کے زمانے میں یہاں کائستھوں کے ایک مشہور خاندان نے سکونت اختیار کر لی تھی اور اپنی خدمات کے صلہ میں موروثی عہدۂ قانون گوئی سے سرفراز ہوا تھا۔ منشی ہرگوپال تفتہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

منشی ہرگوپال تفتہؔ کا سال ولادت ۱۲۱۴ھ ہے۔ ان کے والد موتی لال نے ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست گھر پر ہی کیا۔ ان کو فارسی سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے نہ صرف فارسی سیکھی بلکہ مختلف شاعروں کے دیوان بھی پڑھے۔ "نشترِ عشق" کے مؤلف کے بیان کے مطابق نور العین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعہ نے تفتہؔ میں شعر گوئی کا ذوق پیدا کیا اور وہ تھوڑی سی مشق کے بعد اچھی خاصی غزلیں کہنے لگے۔ "نشترِ عشق" ہی کے مؤلف کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتدا میں راقمؔ تخلص کرتے تھے۔ جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو اپنا تخلص بدل کر تفتہؔ ہو گئے۔ لیکن غالب نے اسے پیار میں مرزا ہرگوپال تفتہ بنا دیا۔

تفتہ نے کچھ دنوں انگریزی محکمۂ بندوبست میں قانون گو کی حیثیت سے کام کیا لیکن شاعری کا شوق ایسا تھا کہ وہ اس کی خاطر اس سے دست بردار ہو گئے۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ان کو ریاست جے پور کی جانب سے ملازمت کی پیش کش کی گئی لیکن یہ تعلق بھی جلد منقطع کر لیا۔ ان کو غالب سے دلی خلوص تھا۔ ۱۸۶۷ء میں غالب بیمار ہوئے اور تفتہ کو خط و کتابت کے ذریعہ ان کی کیفیت معلوم ہوئی تو انھوں نے مالی استطاعت نہ ہونے کے باوجود سکندر آباد سے دہلی کا قصد کیا۔ اور جب تک غالب کی کیفیت اپنی آنکھوں سے خود نہ دیکھ لی، مطمئن نہیں ہوئے۔

تفتہ کا چھوٹا لڑکا پیتمبر سنگھ ۱۲۷۲ھ میں بیمار ہو کر انتقال کر گیا اور اس کے تھوڑے عرصہ بعد لڑکی بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ یہ صدمہ تفتہ کے لیے انتہائی صبر آزما اور حوصلہ فرسا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے صبر و ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور شعر کہہ کہہ کر خود کو بہلاتے رہے۔

۱۵ رمضان ۱۲۹۶ھ کو انتہائی کس مپرسی کے عالم میں سکندر آباد میں انتقال کیا۔ ممتاز احمد تھانوی نے اس شعر سے ان کی تاریخ وفات برآمد کی ہے ؎

سال انتقالش با دل زار از تر د من شنیدم بے سر و پا شد سخن

تفتہ کو اردو شاعری سے دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، فارسی ہی میں لکھا۔ ان کا صرف ایک قطعہ اردو میں ملتا ہے جو انھوں نے غالب کے انتقال پر لکھا تھا۔ بعض لوگوں کے بیان کے مطابق انھوں نے چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ سعدی کی گلستاں کی تضمین بھی لکھی اور بوستاں کے جواب میں سنبلستاں لکھا۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

تیغ افتاد از کف قاتل زندگانی و بال گردن کیست

می دود چار سو تمی دانم برق گرمِ تلاش خرمن کیست

ایں اگر گویم کرا آید یقیں	قصد جانم یار جانی میکند
دل کہ با مرگ آشنائی داشتہ	زندگانی جاودانی میکند
اے تماشا گاہ ایں دل روے تو	عالمے در دل تماشہ کردہ ایم
ما نہ تنہا دیدہ پرُ نم کردہ ایم	آنچہ نتواں کرد آں ہم کردہ ایم
دارد از خود رفتگی با عالمے	رفتہ ایم و سیر عالم کردہ ایم

(۸) فیضانِ غالب : مؤلفہ عرش ملسیانی۔
مطبوعہ غالب اکیڈمی نئی دہلی ۱۹۷۷ء۔

منشی ہرگوپال تفتہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے والد کا نام موتی لال تھا۔ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق شروع سے تھا۔ انگریزی محکمہ بند وبست میں مدتوں قانون گو رہے۔ ۱۸۵۰ء میں تھوڑی مدت کیلئے بے پور بھی گئے تھے لیکن شاعری کے شوق میں ملازمتیں ترک کر دیں۔ ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء کو فوت ہوئے چھوٹے لڑکے پیتمبر سنگھ کی جوانمرگی پر بڑا دل دوز اور طویل مرثیہ لکھا ہے۔

پہلے راتی تخلص کرتے تھے۔ بڑے پُر گو تھے۔ چار ضخیم دیوان یادگار ہیں فارسی میں اساتذہ کی زمینوں میں دادِ سخن دی ہے۔ غالب سے گہرے مراسم تھے۔ وہ انہیں مرزا تفتہ کہتے تھے۔ اور اردوئے معلّٰی میں بہت سے خطوط ان کے نام ہیں۔

اُردو میں صرف ایک قطعہ ہے وہ استاد کی موت پر ہے

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جسکے فیض سے	ہم سے ہزاروں ہیچمداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق	چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پا و سر ہوئے

فارسی میں چار دیوان ہیں۔ ایک مثنوی سنبلستاں بجواب بوستان سعدی۔

چار دیوانوں میں کسی میں بھی بارہ ہزار شعر سے کم نہیں۔ اساتذۂ فارسی کے جواب میں غزلیں کہی ہیں۔

غالبؔ کے خطوط تفتہؔ کے نام

فارسی

خط بنام منشی ہرگوپال تفتہؔ

میرسد گر خویشتن نازد
غالبؔ از خویش خاکسار تراست

دریں ہنگام کہ روزِ سیاہ عمرم را شب است، ودانی کہ روزِ سیاہ را چگونہ تیرہ شبی تواند بود، از تاریکی تنگ دل بودمی و از تنہائی با خویشتن در جنگ تیز دل سودازدۂ من کہ چوں مرا تنہا نگریستے بیچارہ ناچار بہ بیکسیِ من سوختی ظلمت کدۂ من چراغ نداشت، برمن بخشودند وکسی را سوی من فرستادند کہ خستگیہای مرا مرہم آورد و دردِ مرا ہمدمی چارہ گر آمد و شبم را ہزار اختر فروزندہ در کنار، نہادہ تا از نطقِ خویشتن شمعی برافروخت کہ بروشنیِ آں شمعِ فروزان صفای گوہر گفتار خویش را کہ در ہجوم تیرگی بختِ من از چشم من نہاں بودی، آشکار دیدم۔ ہاں، ای تفتۂ شیوہ بیان تو آئین تو ایں فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش فرو خاتی گوہر فروہیدہ فرہنگ را در دیدہ وری بکدام پایہ جا دادہ اند۔ با آنکہ سخن می گویم و سخن گفتن میدانم ، تا ایں بزرگوار را ندیدم نفہمیدم کہ فہمیدنِ سخن چیست و سخن فہم کرا توان گفت در افسانہا دیدہ ام کہ خداوندِ

ہستی بخش حسن را دو تیمہ کرد، یکپارہ ازاں بہ یوسف بخشید و یکپارہ بر جہانیاں افشاند۔ نشگفت کہ فہم سخن و ذوقِ معنی را نیز ہم چنیں دو لخت کردہ لختے بستودہ خوی دادہ، نیمۂ دیگر بہ دیگراں ارزانی داشتہ باشند۔ گو چرخ گردند بکام من بگردد و بختِ غنودہ سر از خوابِ گران بر مدار کہ من بہ نشاطِ ہمدمی ایں دوست از دشمنی روزگار فارغم و بدیں دولت از دنیا فارغ۔ جای شما سبز، روز و شب گرمیِ ہنگامۂ صحبت است و صحبتی نیست کہ شما را یاد نیاریم و گلۂ ہجرانِ شمانہ باہم دگر نسرایم۔ دیروز کہ آدینہ پانزدہم ربیع الاول و نہم فروری بود نامۂ شما رسید و پدید آمد کہ حالیا از اکبرآباد بہ متھرا و از متھرا بہ کول رسیدہ اید ازاں دو ہزار بیت کہ خوشنہ آید کہ در اکبرآباد گفتہ ام، ماہم در اوراقِ اخبارِ اکبرآباد خرمی مشاہدہ کردہ ایم۔ خوش گفتہ اند براہی کہ ما میخواستیم رفتہ اند۔ منشی صاحب نیز ایں نامہ کہ بنامِ من بود خواندند و پیامی کہ ویژہ ایشاں را بود فرا رسیدند۔ و از من خواستند کہ چوں نامۂ شما را پاسخ بگزارم ورقی کہ نوشتہ باشم با ایشاں سپارم تا در مکتوبِ خود فرو پیچند و بسوی شما روان دارند۔ فرمان پذیرفتم و ہم چنیں کردم و امروز کہ شنبہ فردای روز درود تازی نامہ بودہ است ایں نامہ۔ بمخدوم سپردم اگر زود رسد از مخدوم سپاس نپذیرند و اگر دیر رسد بر من چشم گیرند کہ چرا نامہ با ایشاں دادم و خود بڈاک نفرستادم۔ عمر و دولت روز افزوں باد۔

۶۱۸۴۹

نامہ نگار اسداللہ۔ شنبہ ۱۰ فروری

- - - - - - -

ترجمہ

ان دنوں کہ میری عمر کے روز سیاہ کی شب ہے، میری تیرہ شبی کا اندازہ کرو۔ اس تاریکی میں بے چارہ دل تنہا میری بے کسی پر جل رہا تھا کہ ناگاہ میرا ظلمت کدۂ بے چراغ روشن ہوا اور میرے زخموں کو مرہم اور درد کو درماں مل گیا۔ اور ایک شخص نے اپنے لطف کی شمع جلائی۔ جس کی روشنی میں مجھ پر اپنے کلام کی خوبی آشکار ہوئی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نظر سے پوشیدہ تھی۔

ہاں اے نفتۂ شیوہ بیان و نوآیین نوا!

کیا بتاؤں کہ دیدہ وری میں اس روشن طبع دانشور منشی نبی بخش کا کیا پایہ ہے۔ میں ایک عمر سے شعر کہتا ہوں اور رموز شعر سے آگاہ ہوں لیکن جب تک اس بزرگ وار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی خود مجھے خبر نہ تھی۔ کہ سخن فہمی کیا ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ یوسف ؑ کو بخشا اور دوسرا ساری دنیا میں تقسیم کر دیا عجب نہیں کہ اسی طرح سخن فہمی اور ذوق معنیٰ کے بھی دو حصے کیے ہوں اور ایک حصہ اس فرزانۂ یگانہ کو بخشا ہو اور بقیہ دوسروں میں تقسیم کر دیا ہو۔ اب آسمان کی گردش میرے موافق حال نہ ہو، اور میری سوئی ہوئی قسمت اسی طرح سوتی رہے، تو بھی مجھے کوئی غم نہیں۔ میں اس دوست کے "نشاطِ ہمدمی" کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے پروا اور دولتِ دنیا کے مقابلے میں اس ایک دولت پر قانع ہوں۔

یہاں روز و شب محفل گرم رہتی ہے۔ کوئی وقت ایسا نہیں ہو:

تمھارا ذکر نہ ہوتا ہو۔ کل جمعہ ۱۵ ربیع الاول (۹ فروری) کو تمھارا خط ملا۔ جس سے معلوم ہوا کہ تم اکبر آباد سے منحرف ہوتے ہوئے کول پہنچ گئے ہو۔ ان دو ہزار اشعار میں سے جن کے بارے میں تم نے لکھا ہے کہ اکبر آباد میں لکھے گئے تھے، ایک غزل اکبر آباد کے اخبار میں نظر سے گذری۔ بہت اچھی غزل ہے۔ اس میں تم نے وہی روش اختیار کی ہے جو مجھے مرغوب ہے۔ منشی صاحب نے بھی تمہارا خط اور پیام پڑھا، جو تم نے ان کے نام بھیجا ہے۔ انھوں نے خواہش کی ہے کہ میں اپنا جواب لکھ کر انھیں دے دوں تاکہ وہ اپنے خط کے ساتھ تمھیں بھیج دیں۔ چنانچہ آج ہفتہ کو یعنی تمھارا خط ملنے کے دوسرے ہی دن میں نے یہ مکتوب ان کے حوالے کر دیا۔ اگر یہ تمھیں جلد مل جائے تو ان کا شکریہ ادا کرو اور اگر دیر سے ملے تو مجھ سے پوچھنا کہ اپنا خط انھیں کیوں دیا اور ڈاک سے کیوں نہ بھیج دیا۔

عمر و دولت روز افزوں ہو

اسد اللہ

شنبہ ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء

یہ ترجمہ پنج آہنگ (آہنگ پنجم) مترجمہ محمد عمر مہاجر، مطبوعہ ادارۂ یادگار غالب کراچی سے ماخوذ ہے۔

اُردو خطوط

(۱)

مہاراج!

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا۔ لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہر حال مجھ کو، کہ نالایق، ذلیل ترین خلایق ہوں، اپنا دعاگو سمجھتے رہو۔ کیا کروں؟ اپنا شیوہ ترک ہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ "دیوانِ حافظ" کی بموجب فرمائش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے۔ اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ، اگر کسی شاہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ تجلّی میری روش نہیں۔ لہٰذا تم خود فکر

JOHN JACOB a.

نہیں کرتے اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم ونثر
کو مہمل کہیں گے کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ
قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم ونثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے!

ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو
مارالجبن سے کبھی نہ گیا۔ ایک نسخہ "طب محمد حسین خانی" میں لکھا ہے اور وہ
بہت بے ضرر اور بہت سودمند ہے۔ مگر اثر اس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔
وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں۔ اور اس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب
چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے
اس کو پییں۔ تبرید کی حاجت پڑے، وہ بھی اسی پانی میں پییں۔ روز جوش
کروا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا
سلام کہہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا آگے ان کو اختیار ہے۔

[اگست ۹۳۸۶]

(۲)

بھائی!

یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے "فن نارنج گوئی" میں اس کو "کرامت"
اور "اعجاز" کہتے ہیں۔ یہ مصرع سلمان ساوجی و ظہیر کا سا ہے۔ چار لفظ اور
چاروں واقعے کے مناسب۔ یہ مصرع کہہ کر اور مصرع کی فکر کس واسطے؟ واہ
واہ! سبحان اللہ!

اور یہ جو تم کو "فر" کے لفظ میں تردد ہوا اور ایک سو کھا ہما نسخۂ ظہوری
کا لکھا، بڑا تعجب ہے۔ یہ لفظ میرے ہاں "پنج آہنگ" میں دس ہزار[1] جگہ آیا

---

[1] دس ہزار کا لفظ محض ظرافتاً لکھا ہے۔ یعنی تم ہمارے قدیم شاگرد اور ہمارے
کلام کے ورد رکھنے والے اور پھر تم کو یہ خبر نہیں کہ ہماری فارسی نثر میں یہ لفظ متعدد
(بقیہ صفحہ ۵۴ پر)

ہو گا۔ 'فر' اور 'فرہ' لفظ فارسی ہے، مرادف 'جاہ' کے پس 'جاہ' کو اور اس کو کس نے کہا ہے کہ بغیر ترکیب دیے نہ لکھیے؟ 'عالی جاہ' اور 'سکندر جاہ' اور 'مظفر فر' اور 'فریدوں فر' یوں بھی درست۔

اور ایک بات تم کو معلوم رہے کہ اس پورے خطاب کو "خطابِ بہادری" کہنا بہت بے جا ہے۔ سنو، خطاب کے مراتب ہیں۔ پہلے تو "خانی" کا خطاب ہے، اور یہ بہت ضعیف ہے اور بہت کم ہے مثلاً ایک شخص کا نام ہے: میر محمد علی یا شیخ محمد علی یا محمد علی بیگ اور اس کو خاندانی بھی "خانی" نہیں حاصل۔ پس جب اس کو بادشاہِ وقت 'محمد علی خان' کہہ دے۔ تو گویا اس کو "خانی" کا خطاب ملا۔ اور جو شخص کہ اس کا نام اصلی "محمد علی خان" ہے یا تو وہ قوم افغان [سے] ہے یا "خانی" اس کی خاندانی ہے: بادشاہ نے اس کو "محمد علی خان بہادر" کہا۔ اب یہ خطاب "بہادری" کا ہے: اس کو بہادری کا خطاب کہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خطاب "دولگی" کا ہے، یعنی مثلاً "محمد علی خان بہادر" اس کو "منیر الدولہ محمد علی خان بہادر" کہا اب یہ خطاب "دولگی" کا ہوا! اس کو بہادری کا خطاب "نہیں کہتے۔ اب اس خطاب پر افزائش "جنگ" کی ہوتی ہے، "منیر الدولہ محمد علی خان بہادر شوکت جنگ"، ابھی خطاب پورا نہیں، پورا جب ہو گا۔ کہ جب "ملک" بھی ہو۔ پس پورے خطاب کو "خطابِ بہادری" لکھنا غلط ہے۔ یہ واسطے تمہارے معلوم رہنے کے لکھا گیا ہے۔

اب آپ اس سات بیت کے قطعے کو اپنے دیوان میں داخل اور شامل کر دیجیے یعنی قطعوں میں لکھ دیجیے۔ جب تمہارا دیوان چھاپا جاوے گا یہ قطعہ بھی چھپ

بقیہ صد ۵۳ کا

طور پر اور متعدد جگہ استعمال ہوا ہے، پس تمہاری غفلت کی مثال ایسی ہے کہ جو چیز دس ہزار بار دیکھی جائے وہ یاد نہ رہے (غالب)

جاوے گا۔ مگر ہاں، منشی صاحب کے سامنے اس کو پڑھئے اور ان سے استدعا کیجئے کہ اس کو آگرہ بھیجئے تاکہ چھاپا ہو جاوے "اسعد الاخبار" میں اور "زبدۃ الاخبار" میں یقین ہے کہ وہ تمہارے کہنے سے عمل میں لادیں گے مجھ کو کیا ضرور ہے کہ میں لکھوں؟ میں نے یہاں "صادق الاخبار" میں چھپوایا ہے۔

(اگست ۱۸۵۰ء)

(۳)

میں تم کو خط بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔ کل ایک رقعہ میرے پاس آیا کوئی صاحب ہیں عطار اللہ خاں "اور" تامی "تخلص کرتے ہیں۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں۔ ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا، میں نے اس کا جواب لکھ کر اسی دوست کے پاس بھیج دیا۔ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں پڑھ کر حال معلوم کروگے تمہارے شعر میں جو تردد تھا اس کا جواب میں نے لکھا ہے، تم کو بھی معلوم رہے:

"رفت آنچہ بہ منصور، شنیدی تو و من ہم
اے دل، سخنے ہست، نگہدار زبان را"

تردد یہ کہ "آنچہ بہ منصور رفت" نہیں دیکھا؛ "آنچہ بر منصور رفت" درست ہے۔ جواب: بائے موحدہ "علیٰ" کے معنی بھی دیتی ہے۔ پس، جو کچھ "بر" سے مراد تھی وہ بائے موحدہ سے حاصل ہو گئی، اور اگر بائے موحدہ کے معنی معیت کے لیں، تو بھی درست ہے "نظیری" کہتا ہے:

"شادی کہ عین میکشی و دم تیز نی در شہر ایں معاملہ باہر گدا رود"

اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں "معاملہ" ہے اور اس شعر میں "معاملہ" کا لفظ نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ سراسر دونوں شعروں کی صورت ایک ہے۔ "نظیری" کے ہاں "معاملہ" مذکور ہے اور "تفتہ" کے ہاں مقدر ہے۔ "رفت" کا صلہ اور تعدیہ بائے موحدہ کے ساتھ دونوں جگہ ہے۔ والسلام

اسد اللہ [۱۸۵۱ء]

(۴)

کیوں مہاراج ؟

کول ! میں آنا اور منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا ! مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیوں کر جانا کہ تم مجھ کو بھول گئے۔ کول میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی، نہ لکھا کہ میں کیوں کر آیا ہوں اور کب آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابو صاحب سے کہاں جاملوں گا۔ خیر اب جو میں نے بے حیائی کر کے تم کو خط لکھا ہے، لازم ہے کہ میرا قصور معاف کر دو اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو۔

تمھارے ہات کی لکھی ہوئی غزلیں بابو صاحب کی میرے پاس موجود ہیں اور اصلاح پا چکی ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں بھیجوں؟ ہر چند انھوں نے لکھا کہ اکبر آباد ہاشم علی خاں کو بھیج دو؛ لیکن میں نہ بھیجوں گا۔ جب وہ اجمیر یا بھرت پور پہنچ کر مجھ کو خط لکھیں گے، تو میں ان کو وہ اوراق ارسال کروں گا یا تم جو لکھو گے اس پر عمل کروں گا۔

بھائی، ایک دن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔

رقم زدہ یکشنبہ، چہارم جنوری ۱۸۵۲ء

اسد اللہ

(۵)

شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں۔

آپ کا وہ خط جو آپ نے کانپور سے بھیجا تھا پہنچا۔ بابو صاحب کے سیر و سفر کا حال اور آپ کا لکھنؤ جانا اور وہاں کے شعرا سے ملنا سب معلوم ہوا۔ اشعار جناب رند کے پہنچنے کے ایک ہفتے کے بعد درست ہو گئے۔ اور اصلاح اور اشارے اور فوائد جیسا کہ میرا شیوہ ہے عمل میں آیا۔ جب

تک کہ ان کا یا تمہارا خط نہ آوے اور اقامت گاہ معلوم نہ ہو، میں وہ کوا غذ ضروری
کہاں بھیجوں اور کیونکر بھیجوں اور کیوں بھیجوں؟ اب جو تمھارے لکھنے سے جانا
کہ ۱۹ر فروری تک اکبر آباد آؤ گے تو میں نے یہ خط تمہارے نام لکھ کر لفافہ
کرر رکھا ہے۔ آج اُنیسویں ہے پرسوں اکیسویں کو لفافہ آگرے کو روانہ
ہو گا۔ بابو صاحب کو میں نے خط اس واسطے نہیں لکھا کہ جو کچھ لکھنا چاہیے تھا
وہ خاتمہ اوراق اشعار پر لکھ دیا ہے۔ تم کو چاہیئے کہ ان کی خدمت میں میرا
سلام پہنچاؤ اور سفر کے انجام اور حصول مرام کی مبارکباد دو اور اوراقِ
اشعار گزرانو اور یہ عرض کرو کہ جو عبارت خاتمے پر مرقوم ہے اس کو غور سے
پڑھیے اور اپنا دستور العمل گردانیے، نہ یہ کہ سرسری دیکھیے اور بھول جائیے
بس تمام ہوا وہ پیام کہ جو بابو صاحب کی خدمت میں تھا۔ اب پھر تم سے
کہتا ہوں کہ وہ جو تم نے اس شخص دکّونی کا حال لکھا تھا، معلوم ہوا۔ ہر چند اعتراض
ان کا لغو اور پرسش ان کی بے مزہ ہو، مگر ہمارا یہ منصب نہیں کہ معترض کو جواب نہ دیں
یا سائل سے بات نہ کریں۔ تمہارے شعر پر اعتراض، اس راہ سے کہ وہ ہمارا دیکھا ہوا
ہے۔ گویا ہم پر ہے۔ اس سے ہمیں کام نہیں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں؛ کلام ہمارا اپنے
نفس میں معقول و استوار ہے۔ جو زباں داں ہو گا، وہ سمجھے گا۔ غلط فہم و کج اندیش
لوگ نہ سمجھیں، ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ؟ تعلیم و تلقین واسطے
دوستوں کے اور یاروں کے ہے، نہ واسطے اغیار کے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے
تمہیں بارہا سمجھایا ہے کہ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو۔ آج تمھارا
کلام وہ نہیں کہ کوئی اس پر گرفت کر سکے، مگر ہاں۔

حسود را چہ کنم، کو ز خود بہ رنج در است

والسلام والاکرام

رقم زدہ ۱۹ر فروری و مرسلہ بست و یکم فروری سنہ ۱۸۵۲ء

اسد اللہ

(۶)

بندہ پرور!

"بیش از بیش و کم از کم" یہ ترکیب بہت فصیح ہے۔ اس کو کون منع کرتا ہے؛
اور "جلال اسیر" کی یہ بیت بہت پاکیزہ اور خوب ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ در
زبانِ من مہر بیش از بیش شد و در زبانِ تو وفا کم از کم شد"۔ استاد کیا کہے گا؟
اس میں تو تین ٹکڑے کالف و نشر ہے: من اور تو، مہر اور وفا، بیش از بیش اور
کم از کم۔ یاد رہے کہ "بیشتر از بیش و کم تر از کم" اگرچہ بہ حسبِ معنی جائز ہے
لیکن فصاحت اس میں کم ہے۔ "بیش از بیش و کم از کم" افصح ہے۔ وہ شعر تمہارا
خوب ہے اور ہمارا دیکھا ہوا ہے۔

قیس! از تو نہ ایم، وے صبر بیش است ترا، کم است مارا

لیکن ہاں پہلے مصرع میں اگر 'کمتر' ہوتا تو اور اچھا تھا۔ بہر حال اتنا خیال رہے کہ ایسی
جگہ 'تر' کا لفظ افصح ہے۔ چنانچہ میرا شعر ہے ؎

جلوہ کن منت منہ از ذرہ کمتر نیستم حسن یا ایں تابتا کی آفتابے بیش نیست
در ورنہ چشم تو چہ از روزنِ دیوار کم است"

یہاں بہت ہی اوپری معلوم ہوتا ہے اور نرا ہندی کا ترجمہ رہ جاتا ہے، فارسیت
نہیں رہتی۔

"سہل مشمار زندگانی ہا"

مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس مطلع کو یوں درست کر دیا ہے ؎

رایگان است زندگانی ہا می توان کرد جانفشانی ہا

اور اس صورت میں یہ مطلع ایسا ہو گیا کہ میرے دل میں آئی تھی کہ تم کو نہ دوں اور
خود اس زمین میں غزل لکھوں مگر پھر میں نے خست نہ کی اور تم کو دے دیا۔ حضرت
نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ یہ خط جو آپ نے مجھے لکھا ہے شراب کے نشے میں لکھا ہے
اور اصلاحی اوراق بھی اسی عالم میں ملاحظہ فرمائے ہیں۔ اب ع

گلہ تا کے زندگانی ہا

اس کو موقوف کیجئے اور وہ مطلع رہنے دیجئے کہ وہ بہت خوب ہے۔ بعینہٖ مولانا
ظہوری کا معلوم ہوتا ہے۔ بھائی ہمارے اوراقِ اصلاحی کو غور سے دیکھا کرو
ہماری محنت تو ضائع نہ جاوے۔

"ایامے چند" میں جمع الجمع ایسی کھلی ہوئی نہیں ہے مثلاً "معنی چند" اور "احکام
چند" اور "اسرار چند" یہ آدمی لکھ سکتا ہے۔ مگر ہاں "آمال ہا" یہ کھلی سہو ہے ط کا

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے۔ اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈھتے پھریں۔
مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا — ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

میری جان! ایسے موقع میں یہ چاہیے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم موردِ اعتراض
نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔ فقیر گوارا نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور برا
نہ کہے گا حضرت صائب کو۔

شہرت فلانے شخص کے انتقال کی بہ غلط۔ البتہ میرا بھی موجبِ ملال ہے۔
مگر یہ کون واقعۂ عظیم ہولناک ہے کہ صاحبانِ اخبار اس کو چھاپیں۔ آپ اس
طرف اتنا اعتنا نہ فرمایئے۔

گر ماہ و آفتاب بمیرد، عزا مگیر
در تیر و زہرہ کشتہ شود، نوحہ خواں مخواہ

میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں۔ بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی
کرایے کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا
صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ واسطے اطلاع کے تم کو لکھا ہے اگرچہ
میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے۔ در دہلی بہ اسد اللہ برسد،
کافی ہے۔ مگر اب لال کنواں نہ لکھا کرو و محلہ بلی ماراں لکھا کرو۔

اور ہاں صاحب! ہمارے شفیق بابو صاحب کا حال لکھو۔ مسہل سے فراغت ہوئی اور مزاج کیسا ہے؟ اور اب اجمیر اور وہاں سے آبو پہاڑ کو کب جائیں گے؟ میرا سلام بھی کہہ دیجیے۔ والسلام

محررۂ دوشنبہ بست و دوم مارچ ۱۸۵۲ء

اسداللہ

(۷)

کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔

اب ضرور آپڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں۔ میرے پاس آرہے ہیں اور دم بہ دم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں۔ کہیں خاک اڑاتے ہیں۔ میں نہیں تنگ آتا، تو ان معنوی پوتوں سے، کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا؟ آپ ان کو جلد میرے پاس بہ سبیل ڈاک بھیجیے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد ان کو تمہارے پاس بہ سبیلِ ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمہارے عالم صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت رکھے اور تمہارے معنوی بچوں، یعنی نتائجِ طبع، کو فروغ شہرت اور حسنِ قبول عطا فرمائے۔ بابو صاحب کے نام کا خط ان کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے۔ ان کو دے دیجیے گا۔ اور ہاں صاحب بابو صاحب اور تم آبو کو جاتے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخ روانگی لکھ بھیجنا۔ تاکہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا۔

آگاشنبہ جمعہ، ۱۸ جون ۱۸۵۲ء اسداللہ

(۸)

کل تمھارا خط آیا۔ رازِ نہانی مجھ پر آشکارا ہوا۔ میں سمجھا ہوا تھا کہ تم دیوانگی اور شورش کر رہے ہو اب معلوم ہوا کہ حق بجانب تمھارے ہے۔ میں جو اپنے عزیز کو نصیحت کرتا ہوں، تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اے دل، تو اپنے کو اس عزیز کی جگہ سمجھ کر تصور کر کہ اگر تجھ پر یہ حادثہ پڑا ہوتا یا تو اس بلا میں گرفتار ہوا ہوتا، تو کیا کرتا؟ عیاذاً باللہ۔ اب میں تم کو کیوں کر کہوں کہ یہ بے حرمتی گوارا کرو اور رفاقت نہ چھوڑو۔ بلکہ یہ بھی زائد ہے جو دوست سے کہیئے کہ تو ہمارے واسطے اس کو ترک کر۔ بہر حال دوست کی دوستی سے کام ہے۔ اس کے افعال سے کیا غرض؟ جو محبت و اخلاص ان میں تم میں ہے، بدستور بلکہ روز افزوں رہے۔ ساتھ رہنا اور پاس رہنا نہیں ہے، نہ سہی۔

وصلے کہ در آں ملال باشد ہجراں بہ از آں وصال باشد

آمدم بر سرِ مدعا۔ تمہاری رائے ہم کو اس باب میں پسند، عجیب طرح کا پیچ پڑا کہ نکل نہیں سکتا۔ نہ تم کو سمجھا سکتا ہوں اور نہ ان کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مجھے تو اس موقع میں سوائے اس کے کہ تماشائیِ نیرنگِ قضا و قدر بنا رہوں، کچھ بن نہیں آتی۔

بینم کہ تا کردگارِ جہاں دریں آشکارا چہ دارد نہاں

جے پور کا امر محض اتفاقی ہے۔ بے قصد و بے فکر در پیش آیا ہے۔ ہو سنا کانہ اُدھر متوجہ ہوا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بہرا ہو گیا ہوں۔ سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا؛ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا۔ مگر ہاں، استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں، کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔

تا نہالِ دوستی کے بر دہد حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

صحاف کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا۔ آج کل میں آجائے گا۔ پھر اس کے جز و دان کی تیاری کر کے روانا کر دوں گا۔ ابھی "کول" میں آرام کرو، اپنے بچوں میں اپنا دل بہلاؤ۔ اگر جی چاہے تو اکبرآباد چلے جائیو۔ وہاں اپنا دل بہلائیو، دیکھو، اس خودداری میں اُدھر سے کیا ہوتا ہے۔ اور وہ کیا کرتے ہیں۔ والسلام۔

جمعہ، دہم دسمبر سنہ ۱۸۵۲ء

اسداللہ

(۹)

پرسوں تمہارا خط آیا۔ حال جو معلوم تھا، وہ پھر معلوم ہوا۔ غزلیں دیکھ رہا تھا آج شام کو دیکھنا تمام ہوا تھا۔ غزلوں کو رکھ دیا تھا۔ چاہتا تھا کہ ان کو بند کر کے رہنے دوں، کل نو بجے، دس بجے ڈاک میں بھیج دوں۔ خط کچھ ضروری نہیں میں اسی خیال میں تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ "جانی جی" کا خط لایا۔ اس کو پڑھا۔ اب مجھ کو ضرور ہوا کہ خلاصہ اس کا تم کو لکھوں۔ یہ رقعہ لکھا۔ خلاصہ یہ طریقہ ایجا زیہ ہے کہ عرضی گزری" دیوان گزرا راول جی کے نام کا خط گزرا راجہ صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے۔ جانی جی نے جو ایک معتمد اپنا سعداللہ خاں وکیل کے ساتھ کر دیا ہے۔ وہ منتظر جواب کا ہے۔ راول جی نے اجنٹ کے استقبال کو گئے ہیں۔ اور اب اجنٹ علاقہ جے پور کی راہ سے نہیں آتا، آگرے اور گوالیار، کرولی ہوتا ہوا اجمیر آئے گا۔ اور اس راہ میں جے پور کا عمل نہیں۔ پس، چاہیے کہ راول جی الٹے پھر آویں۔ اُن کے آنے پر عرضی کا جواب ملے گا اور اس میں دیوان کی رسید بھی ہوگی۔ بھائی، جانی جی تم کو بہت ڈھونڈھتے اور تمہارے بغیر بہت بے چین ہیں۔ میں نہ تم کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ نہ ان کو سمجھا سکتا ہوں۔ تم وہ کرو کہ جس میں سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ ہاں یہ بھی جانی جی نے لکھا تھا کہ بہت دن کے بعد منشی جی کا خط آیا ہے۔

اسداللہ

(۱۰)

بھائی !

پرسوں شام کو ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط "جانی جی" کا لایا۔ تمھارے خط میں اوراقِ اشعار اور بابو صاحب کے خط میں جے پور کے اخبار۔ دو دن سے مجھ کو وجع الصدر ہے اور میں بہت بے چین ہوں ابھی اشعار کو دیکھ نہیں سکتا۔ بابو صاحب کے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو بھیجتا ہوں اشعار بعد دو چار روز کے بھیجے جائیں گے۔

مرسلہ جمعہ، ۲۵ فروری سنہ ۱۸۵۳ء

اسداللہ

(۱۱)

بھائی !

آج مجھ کو بڑی تشویش ہے۔ اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں جس دن میرا خط پہنچے، اگر وقت ڈاک کا ہو تو اسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو، اور اگر وقت نہ رہا ہو، تو ناچار دوسرے دن جواب بھیجو منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجہ بھرت پور کی بیماری کی خبر سنی جاتی تھی، کل سے اور بری خبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو۔ یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہو گا۔ جلد لکھو کہ کیا صورت ہے ؟ راجہ کا مجھ کو غم نہیں، مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اس علاقہ میں تم بھی شامل ہو۔ صاحبان انگریز نے ریاستوں کے باب میں ایک قانون وضع کیا ہے۔ یعنی جو رئیس مر جاتا ہے۔ سرکار اس ریاست پر قابض و متصرف ہو کر رئیس زادے کے بالغ ہونے تک بندوبست ریاست کا اپنے طور پر رکھتی ہے۔ سرکاری بندوبست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یقین ہے کہ جانی صاحب کا علاقہ بدستور قائم رہے۔ مگر یہ وکیل ہیں، معلوم نہیں مختار کون ہے اور ہمارے

بابو صاحب ہیں اور اس مختار ہیں محبت کیسی ہے۔ رانی سے ان کی کیا صورت ہے
تم اگرچہ بابو صاحب کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو، لیکن انھوں نے از راہِ دور
اندیشی تم کو متوسل اس سرکار کا کر رکھا ہے اور تم مستغنیانہ اور لاابالیانہ زندگی
بسر کرتے تھے۔ زنہار اب وہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو بھی لازم آپڑا ہے، جانی
جی کے ساتھ روشناسِ حکامِ والا مقام ہونا۔ پس چاہیے کول کی آرائش کا ترک
کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ میری رائے میں یوں آیا ہے
اور میں نہیں لکھ سکتا کہ موقع کیا ہے اور مصلحت کیا ہے۔ جانی جی بھرت پور آئے
ہیں یا اجمیر ہیں ہیں، کس فکر میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ واسطے خدا کے نہ مختصر
نہ سرسری، بلکہ مفصّل اور منقّح جو واقع ہوا ہو اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو اور
جلد لکھو کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سنا۔ آج صبح تک لے نہیں
گیا۔ اور یہ خط لکھ کر از راہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب
بیرنگ روانہ کرنا۔ آدھ آنا ایسی بڑی چیز نہیں۔ ڈاک کے لوگ بیرنگ خط
کو ضروری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں اور پوسٹ پیڈ پڑا رہتا ہے جب اس محلے
میں جانا ہوتا ہے تو اس کو بھی لے جاتے ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں کہ پریشان ہوں۔

نوشتہ چاشتگاہ دوشنبہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

ضروری جواب طلب۔

(۱۲)

آج منگل کے دن پانچویں اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک کا ہرکارہ
آیا۔ ایک خط منشی صاحب کا اور ایک خط تمہارا اور ایک خط بابو صاحب کا لایا
بابو صاحب کے خط سے اور مطالب تو معلوم ہو گئے، مگر ایک امر میں میں حیران
ہوں کہ کیا کروں، یعنی انھوں نے ایک خط کسی شخص کا آیا ہوا۔ میرے پاس
بھیجا ہے۔ اور مجھ کو یہ لکھا ہے کہ اس کو الٹا میرے پاس بھیج دینا۔ حالانکہ
خود لکھتے ہیں کہ میں اپریل کی چوتھی کو سپاؤ یا آبو جاؤں گا۔ اور آج

پانچویں ہے۔ بس تو وہ کل روانہ ہو گئے۔ اب میں وہ خط کس کے پاس بھیجوں!
ناچار تم کو لکھتا ہوں کہ میں خط کو اپنے پاس رہنے دوں گا، جب وہ آ کر
مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع دیں گے، تب وہ خط ان کو بھیجوں گا۔ تم کو تردد نہ ہو کہ
کیا خط ہے۔ خط نہیں، بینڈ ھولال کایتھ غمّاز کی عرضی تھی بنام مہاراجہ بیکنٹھ باشی
سعایتِ بابو صاحب پر مشتمل کہ اس نے لکھا تھا کہ ہر دیو سنگھ، جانی جی کا دیوان اور
ایک شاعر دہلی کا دیوان مہاراجہ جے پور کے پاس لایا ہے اور جانی جی کی درستی
روز گار جے پور کی سرکار میں کر رہا ہے۔ اور اس کے بھیجنے کی یہ وجہ کہ پہلے
ان کے لکھنے سے مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ کسی نے ایسا کہا ہے۔ میں نے ان کو لکھا تھا
کہ تم کو میرے سر کی قسم، اب ہر دیو سنگھ کو بلوا لو۔ میں امر جزوی کے واسطے امر کلّی
کا بگاڑنا نہیں چاہتا۔ اس کے جواب میں انھوں نے وہ عرضی بھیجی اور لکھ بھیجا کہ راجہ
مرنے والا ایسا نہ تھا کہ ان باتوں پر نگاہ کرتا۔ اس نے یہ عرضی گزرتے ہی میرے
پاس بھیج دی تھی۔ فقط بارے اس خط کے آنے سے جانی جی کی طرف سے میری
خاطر جمع ہو گئی مگر ایک فکر پڑی یعنی بابو صاحب آلو ہوں گے۔ اگر ہر دیو سنگھ پھر
کر آئے گا تو وہ بغیر ان کے ملے اور ان کے کہے مجھ تک کاہے کو آنے گا۔ خیر! وہ
بھی لکھتا ہے کہ راول کہیں گیا ہوا ہے۔ اس کے آنے پر رخصت ہو گی۔ دیکھیے وہ
کب آوے اور کیا فرض ہے کہ اس کے آتے ہی رخصت ہو بھی جائے۔ تمہاری
غزل پہنچی۔ یہ البتہ کچھ دیر سے پہنچے گی تمہارے پاس۔ گھبرانا نہیں۔ والدعا۔
نگاشتۂ سہ شنبہ روز ورود نامہ
و مرسلہ چہار شنبہ ششم اپریل ۱۸۵۳ء۔ جواب طلب

اسد اللہ

(۱۳)

بھائی!
تم نے مجھے کون سا دو چار سو روپیے کا نوکر یا پنشن دار قرار دیا ہے

جو دس بیس روپیہ مہینا قسط آرزو رکھتے ہو تمھاری باتوں پر کبھی کبھی ہنسی آتی ہے۔ اگر احیاناً تم دہلی کے ڈپٹی کلکٹر یا وکیل کمپنی ہونے تو مجھ کو بڑی مشکل پڑتی۔ بہرحال، خوش رہو اور متفکر نہ ہو۔ پانچ روپیہ مہینا پنشن انگریزی میں سے قسط مقرر ہو گیا تا ادائے زر۔ ابتدائے جون سنہ ۱۸۵۳ء یعنی ماہ آیندہ سے یہ قسط جاری ہو گی۔ بابو صاحب کا خط تمھارے نام پہنچا۔ عجب تماشا ہے، وہ درنگ کے ہونے سے خجل ہوتے ہیں اور میں ان کے عذر چاہنے سے مرا جاتا ہوں۔ ہائے اتفاق۔ آج میں نے ان کو لکھا اور کل راجہ کے مرنے کی خبر سنی۔ واللہ باللہ اگر دو دن پہلے خبر سن لیتا تو اگر میری جان پر آ بنتی، تو بھی ان کو نہ لکھتا۔ جے پور کے آئے ہوئے روپیے کی ہنڈوی اس وقت تک نہیں آئی۔ شاید آج شام تک یا کل تک آ جاوے۔ خدا کرے وہ بابو پہاڑ پر سے ہنڈوی روانہ کر دیں۔ ورنہ پھر خدا جانے کہاں کہاں جائیں گے اور روپیہ بھیجنے میں کتنی دیر ہو جائے گی۔ خدا کرے زرِ مصارف ہردیو سنگھ اسی میں سے مجرا لیں۔ میری کمال خوشی ہے۔ اور یہ نہ ہو تو "۲۵" ہردیو سنگھ کو میری طرف سے ضرور دیں۔ منشی صاحب کا ایک خط ہانسی سے آیا تھا۔ کل اس کا جواب ہانسی روانہ کر چکا ہوں۔ والدعا۔

محررۂ دوشنبہ ۲۰۔ مئی ۱۸۵۳ء

از اسد اللہ

(۱۴)

بھائی!

ہاں میں نے "زبدۃ الاخبار" میں دیکھا کہ رانی صاحب مر گئیں۔ کل ایک دوست کا خط اکبرآباد سے آیا، وہ لکھتا ہے کہ راجہ مرا، رانی (نہیں) مری۔ ابھی ریاست کا [illegible] رنگ قرار نہیں پایا۔ صورتِ انتظام جانی بیجناتھ کے آنے پر موقوف ہے یہاں تک ان دوست کی تحریر ہے۔ ظاہرا اس کو بابو

صاحب کا نام نہیں معلوم۔ ان کے بھائی کا نام یاد رہ گیا۔ صرف اس دوست نے بہ طریق اخبار لکھا ہے۔ اس کو میری اور ’’جانی‘‘ کی دوستی کا بھی حال معلوم نہیں۔ حاصل اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو ہمارے تمھارے دوست کا کام بنا رہے گا۔ آمین یارب العالمین۔

صاحب، جے پور کا مقدمہ اب لایق اس کے نہیں ہے کہ ہم اس کا خیال کریں ایک بنا ڈالی تھی، وہ نہ اٹھی۔ راجہ لڑکا ہے اور چھچھورا ہے۔ راول جی اور سعد اللہ خاں بنے رہتے تو کوئی صورت نکل آتی، اور یہ جو آپ لکھتے ہیں کہ راجہ تیرے دیوان کو پیڑھا کرتا ہے اور پیش نظر رکھتا ہے۔ یہ بھی تو آپ از روے تحریر منشی ہر دیو سنگھ کہتے ہیں۔ ان کا بیان کیوں کر دل نشین ہو؟ وہ بھی جو بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپیہ نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے۔ ہولی ہو چکی اور بیس سے کر چلا۔ پھاگن، چیت، بیساکھ۔ نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے؟ آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔

بندہ پرور، بابو صاحب نے پہلے بار تو مجھ کو دو ہنڈیاں بھیجی ہیں۔ سو سو روپیے کی۔ ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے راجہ صاحب کی طرف سے تا زنج تو تد کنور صاحب کے انعام ہیں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو بطریق نذر شاگردی۔ بعد اُس کے دو ہنڈیاں سو سو روپیے کی بعد چار چار، پانچ پانچ مہینے کے آئیں مع میر احمد حسین کے صلے کے روپیوں کے چار سو اور اس کے علاوہ تین سو، اور چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالہ ہے۔ اگر وہ دو برس کے ہیں۔ تو دو برس ہیں؛ اور اگر وہ تین برس کے ہیں۔ تو تین برس میں یہاں صاحب۔ یہ وہی میر قاسم علی صاحب ہیں جو میرے پرانے دوست ہیں۔ پرسوں یا اترسوں جو ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا تھا۔ وہ ایک خط میر صاحب کے نام کا، کوئی میاں حکمت اللہ ہیں۔ ان کا میرے مکان کے پتہ سے لایا تھا۔ وہ میں نے لے کر رکھ لیا ہے۔ جب میرے صاحب آجاویں

تو تم ان کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ حضرت اگر میرے واسطے نہیں تو اس خط کے
واسطے آپ دتی آیئے۔

(۱۵)

تمھاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔ بھائی کا ہاتھرس سے
آنا معلوم ہوا۔ آویں تو میرا سلام کہہ دینا۔ یہ تمہارا دعاگو اگرچہ اور امور میں
پایۂ عالی نہیں رکھتا۔ مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی بہت محتاج
ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی تمہاری ہمت پر سو ہزار آفرین
ہے پورے مجھ کو اگر دو ہزار ہاتھ آ جاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر
دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور ہل جاتا۔ یہ پانسو تو، بھائی سے
تمہاری جان کی قسم، متفرقات میں جاکر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے۔ سو وہ میرے
صرف میں آویں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بہ قدر پندرہ سے سول
کے باقی رہے گا۔ اور وہ جو سو بابو صاحب سے منگوائے گئے تھے۔ وہ صرف
انگریز سوداگر کے دینے تھے۔ قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمہارے
مشرب میں حلال ہے۔ سو وہ دے دیئے گئے۔ یقین ہے کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط
مع ہنڈوی آ جاوے۔

بابو صاحب کے جو خط ضروری اور کواغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے
تھے۔ وہ میں نے پنجشنبہ ۲۶ مئی کو پارسل میں ان کے پاس روانہ کر دیئے اور اس میں
لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو۔ پنجشنبہ پنجشنبہ ۱۵ دن
آج پورے ہو لیے۔

نگاشتہ پنجشنبہ، نہم جون سنہ ۱۸۵۳ء

از اسداللہ

(۱۶)

عجب تماشا ہے! بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ ہر دیو سنگھ آگیا۔ اور پانسو روپے

کی ہنڈوی لایا! مگر اس کے مصارف کی بابت انتیس روپے کئی آنے اس ہنڈوی میں محسوب ہو گئے ہیں۔ سو میں اپنے پاس سے ملا کر پورے پانسو کی ہنڈوی تجھ کو بھیجتا ہوں۔ میں نے ان کو لکھا کہ مصارف ہر دیو سنگھ کے میں مجرا دوں گا۔ تکلیف نہ کرو۔ "۲۵" یہ میری طرف سے ہر دیو سنگھ کو اور دے دو اور باقی کچھ کم ساڑھے چار سو کی ہنڈی جلد روانہ کر د۔ سو بھائی آج تک ہنڈوی نہیں آئی۔ میں حیران ہوں۔ وجہ حیرانی کی یہ کہ اس ہنڈوی کے بھروسے پر قرض داروں سے وعدہ جون کے اوائل کا کیا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے۔ وہ تقاضہ کرتے ہیں اور میں آج کل، کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ نہیں لکھ سکتا۔ جانتا ہوں کہ سینکڑا پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا تکلف کریں۔ تیس روپے کی کون سی ایسی بات ہے؟ اگر مصارف ہر دیو سنگھ میرے ہاں سے مجرا ہوئے تو کیا غضب ہوا؟ انتیس اور پچیس، چوّن روپیہ نکال ڈالیں اور باقی ارسال کریں۔ لفافے خطوط کے جو میں نے بھیجے تھے، وہ بھی ابھی نہیں آئے یا الہٰی یہ کیسی بات ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ بابو صاحب کہاں ہیں؟ پہاڑ پر ہیں یا بھرت پور آئے ہیں؟ اجمیر آنے کی تو ظاہرا کوئی وجہ نہیں ہے۔ ناچار کثرت انتظار سے عاجز آکر آج تم کو لکھا ہے۔ تم اس کا جواب مجھ کو لکھو کہ وجہ درنگ کی کیا ہے۔ زیادہ، زیادہ۔

مرقومہ پنجم جون سنہ ۱۸۵۳ء روز پنجشنبہ۔ جواب طلب

اسد اللہ

(۱۷)

بھائی!

جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہر دیو سنگھ کی عرضی اور ۲۵ ۲ کی رسید اور "۵۰۰" کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے؟ بابو صاحب نے "۲۵" ہر دیو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہر حال ہنڈوی ۴ دن کی معیادی تھی ۷ دن

گزر گئے ۶ دن باقی تھے مجھ کو صبر کہاں ؟ ہتی کاٹ کر روپے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس "۷/۴" نقد بکس ہیں، اور ۴ بوتل شراب کی اور ۳ شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٖ بھائی صاحب آ گئے ہوں تو میر قاسم علی خاں کا خط ان کو دے دو۔ اور میرا سلام کہو۔ اور پھر مجھ کو لکھو تا کہ میں ان کو خط لکھوں۔ بابو صاحب بھرت پور آ جائیں تو آپ کاہلی نہ کیجئے گا اور ان کے پاس جائیے گا کہ وہ تمہارے جویلے دیدار رہیں۔

سہ شنبہ، ۱۴۔ جون سنہ ۱۸۵۳ء   اسد اللہ

(۱۸)

بھائی،

میں نے مانا تمہاری شاعری کو۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکرِ سخن سے فرصت نہ ہوگی۔ یہ جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو لخت شعر لکھنے کا، اس میں ضرور نشست معنی ابھی ملحوظ رکھا کرو، اور جو کچھ لکھو اس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو۔ کیوں صاحب یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا، اور وہ بھی دلی سے سکندر آباد کو، آیا حاتم کے سوا، اور میرے سوا کسی نے کیا ہو گا! کیا ہنسی آتی ہے تمہاری باتوں پر! خدا تم کو دیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو، تم کو دے۔ جانی جی کی بڑی فکر ہے۔ میں تم کو لکھا چاہتا تھا کہ ان کا حال لکھو۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں یقین ہے کہ اجمیر میں ہوں گے، مگر خط نہیں بھیجا جاتا، کہ وہ وہاں مقیم نہیں ہیں۔ خدا جانے وہ چل سکیں۔ بہر حال تم بھرت پور سے قریب ہو اور ان کے متوسلوں کو جانتے ہو ___ اگر ہو سکے تو کسی کو لکھ کر خبر منگواؤ اور جو کچھ تم کو معلوم ہو، وہ مجھ کو بھی لکھو۔ منشی صاحب مع منشی عبد اللطیف کول میں آ گئے، میں ان کا خط مجھ کو آیا تھا۔ آج اس کا جواب بھی روانہ کر دیا۔

یکشنبہ، ۲۱ ماہ اگست سنہ ۱۸۵۳ء   اسد اللہ

صاحب،

دوسرا پارسل، جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا ہے۔ نہ اصلاح کو جگہ، نہ تحریر سطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا؟ اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ دو ورقہ زیادہ ہو جاتا۔ بہر حال، اب مجھے چننے پڑے ہیں، سوالات۔ اگر کوئی سوال میری نظر نہ چڑھے اور رہ جائے تو سطور کی موڑ توڑ کا گناہ سمجھنا میرا قصور نہ جاننا۔

"یلا ریا ہے" اس میں تامل کیا ہے؟ لفظ صحیح اور پورا تو یہی ہے، "ریا" اس کا مخفف ہے۔

"خارہا در راہش افشانم کہ چوں خواہد شدن"

بہت خوب اور معقول۔ میں اس وقت جانے کس خیال میں تھا۔ "چوں خواہد شدن۔ و کنوں خواہد شدن" ردیف و قافیہ سمجھا تھا۔

لفظ "بے پیر" تورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ جب میں اشعار اردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا، تو تم کو شعر فارسی میں کیوں کر اجازت دوں گا۔ میرزا جلال اسیر علیہ الرحمہ، مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں! لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیرزادۂ ایران ایسا لفظ لکھے۔

"شست بستن" جب ظہوری کے ہاں ہے تو باندھیے۔ یہ روزمرہ ہے اور ہم روزمرہ میں ان کے پیرو ہیں۔ "بے پیر" ایک لفظ ٹکسال باہر ہے، ورنہ صاحب زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں۔

زاہدا، ایں سخت ہرزہ کہ گفتی، چہ شدی
حق غفور است، گناہے شدہ ام تا چہ شود

پہلے زاہد سے یہ سوال غلط کہ "چہ شدی"۔ "ترا چہ شد" سوال ہو سکتا ہے۔

پھر "گناہے شدہ ام" یہ جواب مہمل ۔ "گناہے کردہ ام" جواب ہو سکتا ہے ۔
یہاں تم کہو گے کہ "ہمہ تن گناہ" یا "سراپا گناہ" یا "سراسر گناہ شدہ ام" یہ جواب
اس جواب سے سراسر بے ربط ہے ۔ جب تک "ہمہ تن گناہ" نہ ہو معنی نہیں بنتے
ہرگز ہرگز ۔ اصلاح دیے ہوئے شعر میں مضمون تمہارا ہی رہا اور ٹکسال کے
موافق ہو گیا ۔ عجب ہے تم سے کہ صرف "شدہ ام" اور "تا چہ شود" کے پیوند میں
الجھ کر حقیقتِ معنی سے غافل رہے ۔

بازارِ دل خود از چنیں کار آزار چہ می کنی دلم را

اہلی نے زبردستی کی ہے ۔ مگر ہاں اس نے ایک وجہ ٹھہرائی ہے ۔ یعنی "آزردن" مصدر
اور "آزارد" مضارع اور "آزار" امر ۔ امر بہ معنیٰ اسم جامد آتا ہے اور اسم جامد
"کردن" کے ساتھ پیوند پاتا ہے ۔ خیر رہنے دو ۔

"کند آں آہوے وحشی زبرم فردارم"

یہ شعر مؤیدِ میرے کلام کا ہے ۔ "برد ارم" و "زردارم" و "سردارم" و "تردارم"
یہ سب الفاظ ایک طرح کے ہیں ۔ الف ممدودہ کہیں نہیں ۔ ہاں "بو دارد" و
"رو دارد" و "فرو دآرد" تمہارے عقیدے کی تائید کرتا ہے ۔ مگر یہ شعر
استاد کا نہیں ۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ تھے مولانا علاء الدین ۔

ما مقیمانِ کوے دلداریم

یہ ترجیع بند انھیں کا ہے ۔ ان کو فقر و فنا و سیر و سلوک میں سند
سمجھنا چاہیے ۔ نہ انداز کلام میں ۔

"برِ مور است شمشیرے کہ برموے میاں دارد"

بھائی ، خدا کی قسم یہ مصرع تلوار کی نازکی کی سند نہیں ہو سکتا ۔ یہ تو ایک
مضمون ہے کمر "مور" و "تلوار" "پرِ مور" ۔ وجہ تشبیہ : علاقہ "پرِ مور" با مو
مانند علاقہ "شمشیر" با میان ۔ نزاکت وجہ تشبیہ کبھی نہیں ۔ انصاف شرط ۔ تلوار
کی خوبی "تیزی" ہے یا "نازکی" ؟ یہ دھوکا نہ کھاؤ اور تلوار کو نازک نہ

باندھو۔ 'خو' میں اور "تلوار" میں مناسبت نہیں پائی جاتی۔ جانے دو، شعر سے ہاتھ اٹھاؤ۔

میاں 'خمیدن' بھی صحیح اور "چمیدن" بھی صحیح۔ اس میں کس کو تردّد ہے؟ مگر لغت اور محاورے اور اصلاح میں قیاس پیش نہیں جاتا۔ ہندوستان کے بانوتی لوگوں کو 'خم وچم' بولتے سنا ہے۔ آج تک کسی نظم ونثر فارسی میں یہ لفظ نہیں دیکھا۔ لفظ پیارا، مجھ کو بھی پسند! مگر کیا کروں؟ جو اپنے پیشواؤں سے نہ سنا ہو، اس کو کیوں کر صحیح جانوں؟ 'چمید' صیغہ ماضی کا ہے 'چمیدن' سے اور 'چمیدن'، ایک مصدر ہے، صحیح اور مسلّم۔ چمد مضارع 'چم' امر۔ اس میں کیا گفتگو ہے؟ کلام 'خم وچم' میں ہے۔

سوالات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان کا جواب لکھ دیا۔ اب اشعار کو دیکھتا ہوں۔ خدا کرے، مجھ سے کوئی سوال باقی نہ رہ گیا ہو۔ اور تم بھی جب ان اوراقِ طلسمی کو دیکھو، تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جائے۔ غرض یہ ہے کہ اب پھر اس طرح نہ لکھنا۔ میں بہت گھبراتا ہوں۔

'خمیدست' و 'رسیدست' میں 'نزعی دست'، یہ قافیہ درست ہے۔ مگر 'است کا 'الف' ہرجگہ اڑا دو۔ اور یاد رہے صرف سین 'نے'، کافی ہے الف ضروری نہیں۔

غالبؔ

(۲۰)

تمہارا خط پہنچا، مجھ کو بہت رنج ہوا۔ واقعی ان چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دشوار ہو گا۔ دیکھو میں بھی تو اسی آفت میں گرفتار ہوں۔ صبر کرو اور صبر نہ کرو گے تو کیا کرو گے! کچھ بن نہیں آتی۔ میں مسہل میں ہوں۔ یہ سمجھنا کہ بیمار ہوں، حفظِ صحت کے واسطے مسہل لیا ہے۔ تمہارے اشعار غور سے دیکھ کر بھائی منشی نبی بخش صاحب کے پاس لفافہ تمہارے نام کا بھیج دیا

ہے۔ جب تم آؤ گے تب وہ تم کو دیں گے۔ جہاں جہاں تردّد و تامل کی جگہ تھی وہ ظاہر کر دی ہے۔ اور باقی سب اشعار بدستور رہنے دیے ہیں۔ اب تم کو یہ چاہیئے کہ کول پہنچ کر مجھ کو خط لکھو۔ اس لفافے کی رسید اور اپنا سارا حال مفصل لکھو۔ اس میں تساہل نہ کرو۔ بابو صاحب کے خط کا جواب اجمیر کو روانا کردیا جائے گا۔ آپ کی خاطر جمع رہے۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔

اسد اللہ

(۲۱)

واہ، کیا خوبیِ قسمت ہے میری! بہت دن سے دھیان لگا ہوا تھا کہ اب منشی جی کا خط آتا ہے اور ان کی خیر و عافیت معلوم ہوتی ہے۔ خط آیا اور خیر و عافیت معلوم نہ ہوئی۔ یعنی معلوم ہوا کہ خیر نہیں ہے۔ اور پاؤں میں چوٹ لگی ہے سنو صاحب! یہ بھی غنیمت ہے کہ ہڈی کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اتنا پھیلاؤ بھی اس سبب سے ہوا کہ کوئی مالش کرنے والا نہ ملا اور چوٹ کہنہ ہو گئی۔ البتہ کچھ دیر میں افاقت ہوگی بعد افاقت ہونے کے تم مجھ کو اطلاع کرتے ہیں دیر نہ کرنا۔ میرا دھیان لگا ہوا ہے۔

بابو صاحب کا خط آیا تھا۔ پھر انھوں نے تکلیف کی اور وہ کچھ بھیجا جو آگے بھیجا تھا۔ تمھاری مفارقت سے بہت ملول ہیں۔ طرز تحریر سے فراوانیِ محبت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی جی گئے نہیں، ضرورت کو کیا کریں؟ جلد پھر آئیں گے۔ آپ ان کو اپنے پاس ہی تصور فرمائیے۔ بابو ہرگوبند سنگھ تعطیل میں کول گئے ہوں گے، جو آپ کے خط میں ان کی بندگی لکھی آئی۔ کیوں انھوں نے تکلیف کی؟ بہمہ جہت دو سو قدم پر میرے گھر سے ان کا مکان اور وہ جاتے وقت مجھ سے رخصت نہ ہو گئے۔ اب بندگی سلام کیا ضرور!

ہاں صاحب، یہ تم نے اور بابو صاحب نے کیا سمجھا ہے کہ میرے خط کے سرنامے پر "املی کے محلّے" کا پتہ لکھتے ہو۔ میں "بلّی ماروں" میں رہتا ہوں املی

کا محلہ یہاں سے بے مبالغہ آدھ کوس ہے۔ وہ تو ڈاک کے ہرکارے مجھ کو جانتے ہیں ورنہ خط ہرزہ پھرا کرے۔ آگے کالے صاحب کے مکان میں رہتا تھا اب بلی ماروں میں کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔' املی کا محلہ کہاں اور میں کہاں!

منشی جی کو لکھتے ہو کہ حاکم کے ساتھ گئے ہیں اور پھر لکھتے ہو کہ نہ دورے میں بلکہ اپنے کام کو۔ بہر صورت اب آ گئے ہوں گے۔ میرا سلام کہیے گا اور ابھی خیر و عافیت کے ساتھ ان کی معاودت کی خبر لکھیے گا ورنہ مجھ کو خط لکھنے میں تامل رہے گا۔

'نظر شگفتن، و گوش شگفتن'، ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا نورالدین ظہوری نے لکھا ہو۔

نظارہ راز خون دلم گل در آستیں خوش مگو، بگو کہ ز چشم چمن چکید

یہ نہ سمجھنا کہ "در چمن از چشم چکیدن"، "شگفتنِ گوش و نظر" کے مانند غرابت رکھتا ہے یہ 'خوں فشانی چشم' کا استعارہ ہے اور 'خوں فشانی' صفت چشم ہو سکتی ہے اگر نظر کا خوش ہونا اور کان کا شاد ہونا جائز ہوتا؛ تو ہم اس کا استعارہ یہ شگفتگی کر لیتے۔ خوش ہونا، جب صفت چشم و گوش نہ ہو تو ہم کیا کریں!

یاد رہے یہ نکات سوائے تمہارے اور کو میں نہیں بتاتا۔ میری بات کو غور کر کے سمجھ لیا کرو۔ میں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہوں۔ مگر ہاں ایسی تکرار جیسی 'بیش'، اور 'بیشتر' کے باب میں کی تھی ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صحیح تہمت تھی مجھ پر۔ جو میں آپ لکھونگا، تم کو اس کے لکھنے سے کیوں منع کروں گا؟

اے صد ہزار رازِ نہاں اندریں سخن	گر کم سخن توئی، نگہت کم سخن مباد
ہر چہ با نفسِ خود کنم زبدی	نیکیش نام می توانم کرد

یہ دونوں شعر بے سقم ہیں۔ رہنے دو۔

ہر ناکامیم سلامت باد	کام را کام می توانم کرد

میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کے معنی کیا ہیں! 'کام' کو 'کام'، سب کر سکتے ہیں۔ اس میں لطف کیا ہے؟

زتر کتازیِ آں نازنیں سوار ہنوز ۔ زسبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

حزیںؔ کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے یہ عیب ہے۔ اس کی کون پیروی کرے گا! حزیںؔ تو آدمی تھا۔ یہ مصرع اگر جبرئیل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

بھائی تمہارا مصرع اس قبیل سے نہیں ہے۔ اس میں تو "مکنید" متمم معنی ہے۔ 'مکنید' زاید نہیں ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ اگر فارسی رہنے دو تو، اور اگر ہندی کرو تو، مصرع مہمل اور بے معنی ہے۔

چہ گل چہ لالہ چہ نسرین چہ نسترن مکنید

کیا گلاب کا پھول، کیا لالہ، کیا مونیا، کیا چنبا نہ کرو، زینہار نہ کرو یعنی کیا نہ کرو! اب جب تمہیں کہو کہ صاحب ذکر نہ کرو تب کوئی جانے، ورنہ کبھی جانا نہیں جاتا کہ "ذکر نہ کرو" اے تم نے کہا تھی کہ ہمارا مقصود یہ کہ ذکر نہ کرو حضرت! 'ذکر' مضاف کیونکر ہو سکتا ہے گل و لالہ و نسرین و نسترن کی طرف! کہو گے کہ "ذکر" کا لفظ نہیں، 'بیان' کا لفظ اوپر کے مصرع میں ہے۔ وہ بیان کا لفظ رستوں سے' اور زنجیروں سے ان چاروں لفظوں سے ربط نہیں پاتا۔ مطلع لکھو، قطعہ کہو، ترجیع بند لکھو، یہ مصرع معنی دینے ہی کا نہیں۔ مہمل محض ہے۔

والسلام
اسد اللہ

(۴۲)

صاحب!
دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی 'بخش'، وہی 'بیشتر'، کا قصہ نکلا۔ غلطی ہیں

جمہور کی پیروی کیا فرض ہے ؟ یاد رکھو، یائے تحتانی تین طرح پر ہے :۔

جزو کلمہ :

مصرع = ہمائے بر سرِ مرغاں از آں شرف دارد

مصرع = اے سر نامۂ نامِ تو عقلِ گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے، جزو کلمہ ہے اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے تو شوم، رہنمائے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے : یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح : توحید و تنکیر۔ وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری : آشنائی۔ یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی : آشنائے، یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے دانا نہ کہاؤ گے۔

'نیم گناہ'، 'نیم نگاہ'، 'نیم ناز'۔ یہ روزمرۂ اہل زبان ہے۔ 'نیم' بمعنی 'اندک'، ورنہ گناہ کا آدھا اور 'نگاہ کا ادھواڑ' اور 'ناز آدھا' یہ مہملات ہیں۔ ان چیزوں کا مناقشہ کیا ؟ اگر تم کو 'نیم گناہ' پسند نہیں، 'تازہ گناہ' رہنے دو۔

خستہ، بستہ، تازہ، غازہ، خانہ، دانہ، آوارہ، بیچارہ، روزہ، بوزہ، ہزار لفظ ہیں کہ ان کے آگے جب یائے توحید آتی ہے تو اس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ زرہ، گرہ، کلاہ، شاہ، آگاہ، آگہ، صبحگاہ، صبحگہ، ایسے الفاظ کے آگے اگر تحتانی آتی ہے تو زرہے، گرہے، کلاہے، شاہے، آگاہے، آگہے، گاہے لکھ دیتے ہیں۔

غالب

'دیدمست' یہ لفظ نیا بنایا ہے۔ مقصود تمھارا میں نے تو سمجھ لیا۔ مگر زنہار اور کوئی نہ سمجھے گا۔ "المعنیٰ فی بطن القائل" کے یہی معنیٰ ہیں۔

چشمان پرُخمار، وچشمان بے حیا' ان دونوں ترکیبوں میں سے ایک لکھ لو۔ ان سب اشعار میں نہ عیب، نہ لطف۔

دیکھو صاحب۔ خط میں تم پھر وہی 'بیش'، و 'بیشتر'، کا قصہ لائے ہو۔ 'چہ جرم'، و 'چہ سبب'، وچہ گناہ'، پر جو سند لاتے ہو:

عشق است و صد ہزار تمنا مرا چہ جرم،

اس کی حاجت کیا ہے؟ جاناں مددے، یاراں مددے، یہ تمام غزل اسی طرح کی ہے۔ اگر یہ ترکیب درست نہ ہوتی تو میں ساری غزل کیوں نہ کاٹ ڈالتا؟ دیکھو رفیع السّودا کہتا ہے:

نہ ضرر کفر کو نے دین کو نقصاں مجھ سے
باعثِ دشمنی، اے گبر و مسلماں! مجھ سے

غالبؔ کہتا ہے:

مجھ تک کب اس کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

یعنی اب جو دور مجھ تک آیا ہے، تو میں ڈرتا ہوں۔ یہ جملہ سارا مقدر رہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔ مگر:

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

یہ فرق البتہ وجدانی ہے، بیانی نہیں۔

اگر دریافتی، بر دانشت بوس — دگر غافل شدی افسوس افسوس!

روز جمعہ ۱۳۔ جنوری ۱۸۵۷ء — از اسد اللہ

(۲۴)

بندہ پرور!

ایک مہربانی نامہ سکندر آباد سے اور ایک علی گڑھ سے پہنچا یقین ہے کہ بابو صاحب تمہارے خط کے جواب میں کچھ حال لکھیں گے اور تم موافق اپنے وعدے کے مجھ کو لکھو گے۔ اب جب اس خط کا جواب تمہارے پاس سے آئے گا تب تمہارے اشعار نظم کو پہنچیں گے۔ ہائے، ہائے! میر تفضل حسین خان۔ ہلئے۔ ہائے۔

رفتی و مرا خبر نہ کردی　　بر بیکسیم نظر نہ کردی

یہاں یہ سنا گیا ہے کہ میر احمد حسین، بڑا بیٹا ان کا، ان کے کام پر مقرر ہوا اور میر ارشاد حسین بدستور نائب رہے۔

۲۳، فروری ۱۸۵۴ء　　اسد اللہ

(۲۵)

منشی صاحب!

تمہارا خط اس دن یعنی کل بدھ کے دن پہنچا کہ میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں، اور مزا یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے، کھانا مطلق میں نے نہیں کھایا۔ آج پنج شنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب، حرارت مزاج میں بہت ہے۔ ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے، ہرگز بھوک نہیں لگی۔ اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ بابو صاحب والا مناقب کا خط تمہارے نام کا دیکھا اب اس ارسال میں وہ آسانی نہ رہی اور بندہ دشواری سے بھاگتا ہے۔ کیوں تکلیف کریں؟ اور اگر بہر حال ان کی مرضی ہے تو خیر۔ میں فرماں پذیر ہوں اشعار سابق و حال میرے پاس امانت ہیں۔ بعد اچھے ہونے کے ان کو دیکھوں گا۔ اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہ ہزار جرِ ثقیل لکھی گئی ہیں۔

روز پنج شنبہ ۲، مارچ ۱۸۵۴ء　　اللہ

(۲۶)

میرا اسلام پہنچے!

خط اور کاغذ اشعار پہنچا۔ سابق و حال ابھی سب یوں ہی دھرے رہیں گے۔ اگرچہ گرمی رفع ہو گئی۔ مینہ برسنے لگے، ہوائے سرد چلنے لگی ہے مگر دل مکدّر رہے اور حواس ٹھکانے نہیں۔ بادشاہ کا قصیدہ سارا اور ولی عہد کا قصیدہ بے خاتمہ آگے سے یہ رکھا تھا۔ اس کا خاتمہ بہ ہزار مشقت رمضان میں کہہ لیا اور عید کو دونوں پڑھ دیئے۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کو پرسوں یا اترسوں بھیجوں گا۔ ان سے لے کر تم بھی دیکھ لینا۔ میں نے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی ہرگوپال صاحب کو بھی دینا کہ وہ پڑھ لیں اور چاہیں تو نقل لے لیں۔ اس کے سوا اور جو کچھ، تمہارے خط میں لکھا تھا وہ جواب طلب نہیں اور یوں ہی ہے جو تم سمجھے ہو۔

جولائی ۱۸۵۴ء

اسد اللہ

(۲۷)

دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کیے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے، میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ و رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جاوے، دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔

صاحب، جہاں تقطیع میں الف نہ سمائے، وہاں کیوں لکھو؟

اسد اللہ

(۲۸)

صاحب۔

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا۔ وہ ایک جنم تھا کہ

جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں، تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوستِ دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط! بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلّہ کا نام 'بلّی ماروں کا محلہ' ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ! ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا! کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ اگر کچھ ہیں، تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ، میں حکیم محمد حسن خان مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبانِ عالی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بر وقتِ غارتِ دہلی یہ لوگ بچ رہیں، چنانچہ بعدِ فتح راجہ کے سپاہی آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر، غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولتمند، اہلِ حرفہ، کوئی نہیں ہے۔ مفصّل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدّت ہے اور باز پرس اور داروگیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو، اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی

خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف پادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی۔ لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی؟ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون، جو میرے پاس آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے! یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہر حال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔

شنبہ ۵، دسمبر ۱۸۵۷ء

(۲۹)

آج سنیچر بارہ کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمہارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو دیا۔ وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔ میں تم کو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آ کر کیا کرو گے! نیک گھڑی ہے خدا کرے، تمہارا روپیہ مل جائے۔

بھائی، میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، دارو گیر

سے محفوظ ہوں، کسی طرح کی باز پرس ہو، تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا۔ خود بھی برو ے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ کہو یہ نو، دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے؟ انجام کچھ نظر آتا نہیں کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے۔ ہرگوبند سنگھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔
والدعا۔

روز شنبہ۔ سی ام جنوری ۱۸۵۸ء۔ وقت نیم روز غالبؔ

(۳۰)

از عمر و دولت برخوردار باشند
بدھ کا دن تیسری فروری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط مع رجسٹری لایا۔ خط کھولا۔ سو روپے کی ہنڈی، بل، جو کچھ کہیے، وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لے کر "بیل کے کٹڑے" چلا گیا۔ سو روپے چہرۂ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اکٹھے تھے وہ دیے گئے۔ پچاس روپے محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپے باقی رہے۔ وہ بکس میں رکھ دیے۔ روپے کے رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا، سو یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے۔ اگر جلد آگیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیجدوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی بڑی آپنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

چہارشنبہ ۳، فروری ۱۸۵۸ء۔ وقت دوپہر

غالبؔ

(۳۱)

صاحب!
تم نے لکھا تھا کہ میں جلد آگرے جاؤں گا۔ تمہارے اس خط کا جواب

نہ لکھ سکا۔ جواب تو لکھ سکتا تھا۔ مگر کلیان کا پاؤں سوج گیا تھا۔ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا۔ ناچار تم کو خط نہ بھیج سکا۔ بعد چند روز کے جو کہار اچھا ہوا، تو میں تم کو آگرے میں سمجھ کر سکندر آباد خط نہ بھیج سکا۔ مولوی قمر الدین خاں کے خط میں تم کو سلام لکھا کل ان کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرزا تفتہ ابھی یہاں نہیں آئے۔ اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں۔ میرا حال بدستور ہے۔ دیکھیے، خدا کو کیا منظور ہے۔ حاکم اکبر نے آکر کوئی نیا بندوبست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب میرے آشنائے قدیم ہیں۔ مگر میں مل نہیں سکتا۔ خط بھیج دیا ہے۔ ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔ تم لکھو کہ اکبر آباد کب جاؤ گے۔ والدعا۔

جمعہ ۵ر مارچ ۱۸۵۸ء غالبؔ

(۳۲)

جانِ من و جانانِ من۔

کل میں نے تم کو سکندر آباد میں سمجھ کر خط بھیجا۔ شام کو تمھارا خط آیا۔ معلوم ہوا کہ تم اکبر آباد پہنچے۔ خیر، وہ خط پوسٹ پیڈ گیا ہے، شاید الٹا نہ پھرے۔ اگر پھر آئے گا تو خیر۔ آج یہ خط تم کو اکبر آباد بھیجتا ہوں پہنچے پر جواب لکھنا۔

نقطیع رباعی کی بہت خوب! مگر خیر، ہر ایک بات کا ایک وقت ہے۔ ہم کو ہر طرح لطفِ صحبت اور لطفِ شعر اٹھا لینا! بھائی منشی نبی بخش صاحب کے نام کا خط پڑھ کر ان کو دے دینا اور اس کا مضمون معلوم کر لینا۔ جس حاکم کو میں نے خط اور قطعہ بھیجا ہے، اس کے سررشتہ دار کوئی صاحب ہیں۔ من پھول ان کا نام ہے۔ مجھ سے ناآشنائے محض ہیں۔ اگر تعارف ہوتا تو استدعا کرتا کہ اس تحریر کو پیش کیجیے۔ کاش تم سے آشنائی ہوتی، تو تمھیں اوپر اوپر خط لکھ کر ان کو بھیج دیتے کہ غالبؔ ایک فقیر گوشہ نشین اور بے گناہ محض اور واجب الرحم ہے، اس کے حصولِ مطالب میں سعی سے دریغ نہ کرنا۔

می تواں آورد استغنا سفارش نامۂ
چرخ کج رو را اگر دانیم کز یاراں کیست

باقی جو حال ہے، وہ بھائی کے نام کے ورق میں لکھ چکا ہوں۔ تم پڑھ لو گے۔ دوبارہ لکھنا کیا ضرور؟

شنبہ ۶، مارچ ۱۸۵۸ء۔ جواب طلب۔

(۳۳)

صاحب!

تمہاری سعادتمندی کو ہزار ہزار آفریں۔ تم کو یونہی چاہیے تھا۔ لیکن میں نے ایک بات بہ طریقِ تمنا لکھی تھی، جیساکہ عربی میں "لَیتَ" اور فارسی میں "کاشکے"۔

اب تم روداد سنو: عرضی میری سر جان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گذری اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا، یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنسن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے یہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو ان کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے۔ جو اس کو دیکھیں گے۔ بہرحال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

مولوی قمرالدین خاں کا کوں نہ جاتا اور راستے سے پھر آنا معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ ان کو زندہ اور تندرست رکھے۔ میرا سلام کہنا اور یہ خط پڑھا دینا۔ بھائی منشی

نبی بخش صاحب کو سلام اور ان کے بچوں کو دعا کہنا۔ اور یہ خط ضرور ضرور پڑھا دینا اور کہنا کہ بھائی ہدایت تو اچھی ہے۔ نہایت بھی خدا اچھی کرے۔ وہ عزت اور وہ ربط وضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے، تو غنیمت ہے۔ گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور اجنٹی وکمشنری و دیوانی و فوجداری وکلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے۔ مشتمل اس حکم پر خط میرے نام آیا ہے۔ حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جاوے کہ یوں کرو۔ عملے نے خط نہ لکھا۔ صرف وہ عرضی حکم پر چڑھی ہوئی بھیج دی۔ بیت

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

سنو! میرزا تفتہ اب میں جو اپنا حال تم کو لکھا کروں، وہ تم میرے بھائی کو اور مولوی قمرالدین خان کو دکھا دیا کرو۔ تین تین جگہ ایک بات کو کیوں لکھوں؟

جمعہ ۱۲، مارچ ۱۸۵۸ء

(۳۴)

صاحب!

کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی؟ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمرالدین خاں کا سلام بھی آیا۔ اور بھائی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی وہ تو نہین کی فکر میں تھے۔ ظاہراً یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالیٰ ان کی جو مراد ہو بر لاوے ان کو میرا سلام کہہ دینا۔ بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا۔ مولوی قمرالدین خان کو بھی سلام کہنا تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو ہیں تو بلیں جزو ہیں تو بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا! قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیج دو۔

یکشنبہ ۱۱، اپریل ۱۸۵۸ء غالب

(۳۵)

میرزا تفتہ

عجب اتفاق ہوا۔ پنج شنبہ کے دن ۲۲ر اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا کہ اس کے متعاقب پارسل کا ہرکارہ آیا اور تمہارا بھیجا ہوا پاکٹ لایا۔ رسید لکھنی میں نے زائد سمجھی اور اس کا دیکھنا شروع کیا۔ بے کار محض اور تنہا ہوں۔ پانچ پہر کا دن۔ میری بڑی دل لگی ہوئی۔ خوب دیکھا۔ سچ تو یوں ہے کہ ان اشعار میں میں نے بہت حظ اٹھایا۔ جیتے رہو۔ تمہارا دم غنیمت ہے۔

بھائی کا حال مفصل لکھو۔ پنسن کے طالب ہیں یا نوکری کے۔ منشی عبداللطیف کہاں ہے اور کس طرح ہے؟ علاقہ بنا ہوا ہے یا جاتا رہا؟ صاحب لفٹنٹ گورنری کا محکمہ بالکل الہ آباد کو گیا یا ہنوز کچھ یہاں بھی ہے؟ منشی غلام غوث صاحب کہاں ہیں؟ نوکر ہیں یا مستعفی؟ عدالتِ دیوان کا محکمہ یہیں رہے گا یا الہ آباد جائے گا؟ اس کا اور گورنری کے محکمے کا ساتھ ہے۔ چاہیے یہ بھی وہیں جاوے۔

آج تمہارے اشعار کا کاغذ پمفلٹ پاکٹ اسی خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجا گیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ خط کل پرسوں اور وہ پاکٹ پانچ چار دن میں پہنچ جائے۔

یکشنبہ۔ ۲۵ر اپریل ۱۸۵۸ء غالب

(۳۶)

صاحب!

۲۵ر اپریل کو ایک خط اور ایک پارسل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں۔ آج ۳۰ ہے۔ یقین ہے کہ خط اور پارسل دونوں پہنچ گئے ہوں گے۔ ایک امر ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں۔ ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے، اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر، قوم کا کھتری خوبصورت نوجوان، وضعدار ۱۲۷۴ھ میں بیمار پڑ کر مرگیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک دنا دنیع، اس کے مرنے کی

لکھوں ایسی کہ وہ فقط "تاریخ" نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے سو بھائی اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر متروک معہذا یہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے۔ جو خونچکاں شعر تم نکالو گے وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے؟ بطریق مثنوی بائیس تیئیس شعر لکھ دو۔ مصرع آخر میں مادہ "تاریخ" ڈال دو۔ نام اس کا برج موہن تھا اور اس کو بابو، بابو کہتے تھے۔ چنانچہ میں بحر ہزج مسدس مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں۔ چاہو اس کو آغاز میں رہنے دو اور آئندہ اسی بحر میں اور اشعار لکھ لو، چاہو کوئی اور طرح نکال لو۔ لیکن یہ خیال میں رہے کہ سائل کو متوفی کے نام کا درج ہونا منظور ہے اور "بابو برج موہن" سوائے اس بحر کے یا بحر رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا۔ وہ شعر میرا یہ ہے ؎

برم چوں نام بابو برج موہن	چکد خونِ دلِ ریش از لبِ من

نگاشتہ روز جمعہ۔ سی ام اپریل ۱۸۵۸ء	غالب

(۳۷)

بھائی!

وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زیست کی نہ رہی قولنج اور پھر کیا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارہ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔ اس وقت تو بچ گیا۔ مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں، میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنا اور آلو بخارا کا افشردہ، اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے۔ آج صبح کو بعد دوا پینے کے تم کو یہ خط لکھا ہے یقین تو ہے کہ آج پیٹ بھر کر روٹی کھا سکوں۔

صاحب، وہ جو میں نے ۲۲ شعر مرثیے کے لکھ کر تم کو بھیجے اس سے مقصود یہ تھا کہ تم اپنے اشعار دو سرے ماتم زدہ کو دے دو۔ کس واسطے کہ تمہاری

تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور بھی فلک زدہ ہے۔ اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ کچھ اوپر اسّی شعر میں سے ایک شعر بھی تو نے نہ لیا، اس کا حال یہ ہے کہ وہ شعر سب دست و گریبان تھے، ایک کو ایک سے ربط۔ ایک یا دو شعر اس میں سے کیوں کر لیے جاتے؟ اشعار سب میرے پسندیدے سقم نہ بے عیب۔ وہ جو تم لکھتے ہو کہ ؎

حرفِ یا لیو برج موہن میز نم

اور اس کا دوسرا مصرع میں بھول گیا ہوں مگر قافیے میں 'من' ہے۔ یہ شعر غالبؔ کو بُرا معلوم ہوا ہو گا۔ واللہ باللہ! جب تک کہ تم نے نہیں لکھا، میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بہر حال، بات وہی ہے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔

یارے، اب کہیے! بھائی منشی نبی بخش صاحب اور مولوی قمر الدین خاں صاحب، روزوں کے متوالے ہوش میں آئے یا نہیں؟ آج ۱۰ شوال کی ہے۔ شش عید کا بھی زمانہ گذر گیا۔ خدا کے واسطے ان کی خیر و عافیت لکھو اور یہ عبارت بھائی صاحب کی نظرِ انور سے گذرانو۔ شاید وہ مجھ کو خط لکھیں۔

محررہ و مرسلہ دو شنبہ ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء غالبؔ

(۳۸)

کیدار صاحب!

مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا۔ یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں اس سے گذر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ اُن دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط کی موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں کے خط کے آنے کی توقع۔ اس میں وہ

دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ہاں، ایک تم کہ ہر مہینہ میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو
سنو صاحب۔ اپنے پر لازم کرلو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آپڑا
دو خط تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔
بھائی صاحب کا بھی خط دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا۔ اس کا جواب بھیج
دیا گیا۔ مولوی قمرالدین خاں یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں، کس واسطے کہ مجھ کو مئی
میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤں گا۔ بہرحال اگر آپ آزردہ نہیں، تو جس
دن میرا خط پہنچے اس کے دوسرے دن اس کا جواب لکھیے۔ اپنی خیر و عافیت
منشی صاحب کی خیر و عافیت، مولوی صاحب کا احوال۔ اس سے سوا گوالیار کے
فتنہ و فساد کا ماجرا، جو معلوم ہوا ہو وہ الفاظِ مناسبِ وقت میں ضرور لکھنا۔
راجہ جو وہاں آیا ہوا ہے۔ اس کی حقیقت؛ دھول پور کا رنگ، صاحبانِ عالی
شان کا ارادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے؟ آگرے کا حال کیا ہے۔
وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں؟

نگاشنبہ سہ شنبہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء   غالبؔ

(۳۹)

جیتے رہو اور خوش رہو۔

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

زیادہ خوشی کا سبب یہ ہے کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پیرایہ دے دیا تھا۔ گرمی
ہنگامۂ انطباعِ دیوان وغیرہ میں پہلے سے جانتا ہوں۔ بنک گھر کا روپیہ مصروف
کاغذ دکان ہے۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ مغتنمات میں سے ہو۔ رجب علی بیگ سرور
نے جو 'افسانۂ عجائب' لکھا ہے، آغازِ داستان کا شعر مجھ کو بہت مزا دیتا ہے ؂

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ   یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعِ ثانی کتنا گرم ہے اور 'یاد رکھنا' فسانہ' کے واسطے کتنا مناسب!
منشی عبداللطیف کے گھر میں لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر مجھ کو ہو چکی ہے۔

اور تہنیت میں بھائی کو خط لکھ چکا ہوں۔ اب جو ان سے ملو، تو میرا سلام کہ کر اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دے لینا۔ مولوی معنوی جب کا تپور سے معاودت فرمائیں، مجھ کو اطلاع دینا۔ میرا حال بدستور۔

ہماں پہلو، ہماں بستر، ہماں درد

شنبہ ۔ ۲۶ ۔ جون ۱۸۵۸ء ۔ روز ورود نامہ غالب

(۴۰)

دیکھیو غالبؔ! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور!

پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا۔ اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں، اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ میرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھ دینا ؎

شرط اسلام بود ورزش ایماں بالغیب اے تو غائب زنظر مہر تو ایمان من ست

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس بے تکلف عمر بسر کرے۔ اس کا نام عیش ہے۔ تمہاری توجہ مفرط بہ طرف شعر و سخن کے تمہاری شرافت نفس اور حسن طبع کی دلیل ہے۔ اور بھائی، یہ جو تمہاری سخن گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آ جاتا ہے۔ ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں ؎

اے مرگ ناگہاں ! تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم۔ مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہات سے قتل ہوئے۔ اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے ! اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۴۱)

میرزا تفتہ کو دعا پہنچے !

بہت دن سے خط کیوں نہیں لکھا؟ آگرے میں ہو یا نہیں؟ میرزا حاتم علی صاحب کا شفقت نامہ آیا۔ یہاں سے اس کا جواب بھیجا گیا۔ وہاں سے اس کا جواب آگیا۔ میر مکرم حسین صاحب کا خط پرسوں آیا۔ دو چار دن میں اس کا جواب لکھوں گا۔ میرا حال بدستور ہے۔

نہ نوید کامیابی، نہ نہیبِ نا امیدی

بھائی تمھارا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور وہ میرے خط کے جواب میں ہے۔ دو ایک دن کے بعد جب جی پانیں کرنے کو چاہے گا، تب ان کو خط

لکھوں گا۔ تم اگر ملو تو ان سے کہہ دینا کہ بھائی قاسم علی خاں کے شعر نے مجھ کو بڑا مزا دیا
حسن اتفاق یہ کہ کئی دن ہوئے تھے، جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی رومال
ڈھائی گز ادلال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔ میں روپیہ
لے کر اور خط پڑھ کر خوب ہنسا کہ خط اچھے وقت آیا۔

۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء غالبؔ

(۴۲)

میرزا تفتہؔ!

کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط بانٹا کرتا ہے،
آیا اور اس نے پارسل مومجامے میں لپٹا ہوا دیا۔ پہلے تو میں بھی حیران رہا کہ
پاکٹ خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا۔ یارے جب اس کی تحریر دیکھی تو تمھارے
ہات کا پمفلٹ لکھا ہوا اور دو ٹکٹ لگے ہوئے۔ مگر اس کے آگے کالی مہر اور
کچھ انگریزی لکھا ہوا۔ ہرکارے نے کہا کہ ایک روپیہ دس آنے دلوائیے۔ دلوادیئے
اور پارسل لے لیا۔ مگر حیران کہ یہ کیا پیچ پڑا۔ قیاس ایسا چاہتا ہے کہ تمہارا
آدمی جو ڈاک گھر گیا اس کو خطوں کے بکس میں ڈال دیا۔ ڈاک کے کارپردازوں
نے غور نہ کی اور اس کو بیرنگ خطوں کی ڈاک میں بھیجدیا۔

وہ صاحب جو میرے عرف سے آشنا اور میرے نام سے بیزار ہیں۔
یعنی منشی بھگوان پرشاد، مثل خواں، میرا سلام قبول کریں۔

۲۸ر جولائی ۱۸۵۸ء غالبؔ

(۴۳)

میرزا تفتہؔ!

تمہارے اوراقِ مثنوی کا پمفلٹ پاکٹ پرسوں ۵ر اگست کو
اور میرزا حاتم علی صاحب کی نثر شاید آغازِ اگست میں روانا کرچکا ہوں
اس نثر کی رسید نہیں پائی اور نہیں معلوم ہوا کہ میری خدمت مخدوم کے

مقبول طبع ہوئی یا نہیں۔ نہیں معلوم بھائی نبی بخش صاحب کہاں ہیں اور کس طرح
ہیں اور کس خیال میں ہیں۔ نہیں معلوم مولوی قمرالدین خان الہ آباد سے آ گئے یا
نہیں۔ اگر نہیں آئے، تو وہ وہاں کیوں متوقف ہیں! میر منشی قدیم وہاں پہنچ گئے
اپنا کام کرنے لگے! یہ کیا کر رہے ہیں! آپ کو یہ تاکید لکھتا ہوں کہ ان باتوں
یا توں جواب الگ الگ لکھیے اور جلد لکھیے۔ اس خط کے پہنچنے تک اغلب ہے
کہ پارسل پہنچ جائے۔ اس کے پہنچنے کی بھی اطلاع دیجیے گا۔

اب ایک امر سنو! میں نے آغاز یازدہم مئی، ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی
۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں
لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم میں
لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے۔ وہ بھی
بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔ وہ عربی، انگریزی
ہندی، جو ہیں وہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً تمہارا نام منشی ہرگوپال، منشی لفظ عربی
ہے۔ نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ "شیوا زبان"، لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس
رقعے میں ہے، یعنی نہ چھدرا نہ گنجان، اوراق بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحے
میں بیس سطر اور کسی میں بائیس سطر بلکہ کسی میں انیس سطر بھی آئے چالیس
صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو
جز وہیں آ جائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں کہ آگرے میں کاپی نگار
خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو
اس تہی دستی اور بے نوائی میں پچیس کا میں کبھی خریدار ہو سکتا ہوں لیکن
صاحب مطبع اتنے پہ کیوں ماننے لگا! اور البتہ چاہیئے کہ اگر ہزار نہ ہوں تو
پانسو جلد تو چھاپی جائے یقین ہے کہ پانسو، سات سو جلد چھاپنے کی صورت
میں نہیں آتے، چار آنے قیمت پڑے۔ کاپی تو ایک ہی ہو گی۔ رہا کاغذ
وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی متن کی تو آپ کو معلوم ہو گئی۔ حاشیے پر البتہ

لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہر حال اگر ممکن ہو تو اس کا تکدمہ کر دا ور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو اگر منشی قمرالدین خاں آگئے ہوں۔ تو ان کو بھی شریک مصلحت کر لو۔ ان تینوں باتوں کا جواب اور پارسل کی رسید اور اس مطلب خاص کا جواب یہ سب ایک خط میں پاؤں۔ ضرور، ضرور، ضرور!

نگاشتہ و روان داشتہ سہ شنبہ، ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء
جواب طلب۔ واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا گیا۔

غالب

(۴۴)

بھائی!

تمھارا وہ خط جس میں اوراق مثنوی ملفوف تھے، پہنچا۔ اوراقِ مثنوی اوراقِ دستنبو، کے ساتھ پہنچیں گے۔ اب تمھارے مطالب کا جواب جدا جدا لکھتا ہوں۔ الگ الگ سمجھ لینا۔

صاحب، تم نے مرزا حاتم علی صاحب سے کیوں کہا؟ بات اتنی تھی کہ وہ مجھ کو لکھ بھیجئے کہ نثر آئی اور مرزا صاحب نے پسند کی۔ اب ان سے میرا سلام کہو اور یہ کہو کہ آپ کے شکر بجا لاتے کا شکر بجالاتا ہوں۔ چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکۂ معظمۂ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو۔ طرزِ تحریر کیا ہو گی اور صاحبانِ مطبع کو اُس کا انطباع کیوں نا مطبوع ہو گا۔ جیتے رہو اس عمر دگی میں مجھ کو ہنسایا! وہ کون ملّا تھا جس نے تم کو پڑھایا:

گرچہ "عملکار" خردمند نیست "

"عملکار" = "اہلکار"؟

یہ شعر شیخ سعدی کا بادشاہ کی نصیحت میں ہے۔

مجز بہ خردمند مفرما عمل

یعنی "خدمت و اعمال سوائے علما اور عقلا کے اور کے تفویض نہ کر"۔ پھر خود کہتا ہے:

گرچہ عمل کارِ خردمند نیست

یعنی "اگرچہ خدمات و اشغالِ سلطانی کا قبول کرنا خردمندوں کا کام نہیں اور عقل سے بعید ہے کہ آدمی اپنے کو خطرے میں ڈالے"۔ 'عمل' الگ ہے اور "کار" مضاف ہے بطرف 'خردمند' کے ورنہ دوہائی خدا کی۔ "عملکار" "اہلکار" کے معنی پر نہیں آتا۔ مگر تبتیل اور واقف یا اور یورپ کے ملکیوں کی فارسی۔

(۴۵)

صاحب!

عجب اتفاق ہے آج صبح کو ایک خط تم کو اور ایک خط جاگیر کے گاؤں کی تہنیت میں اپنے شفیق کو ڈاک میں بھیج چکا تھا کہ دوپہر کو رضی الدین نیشاپوری کا کلام ایک شخص بیچتا ہوا لایا۔ میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔ قضارا جب میں نے اس کو کھولا، اسی ورق میں یہ مطلع نکلا ؎

اگر بہ گنج گہر میلم وافتاد چہ باک! کفِ جوادِ ترا از برائے آں داریم

چاہتا تھا کہ تم کو لکھوں کہ ؟ تمہارا خط آیا۔ مجھ کو لکھنا ضرور ہوا۔ آج تمہیں دو خط بھیجے ہیں۔ ایک تو صبح کو پوسٹ پیڈ اور ایک اب، بارہ پر تین بجے، بیرنگ۔ اس شعر کو اب چاہو رہنے دو۔ ہائے ہائے! تم بھائی سے ملے۔ غیاث اللغات کھلوائی۔ 'جواد' کا لغت دیکھا۔ مگر میرا ذکر نہ کیا کہ وہ تمہارا جو یائے حال ہے۔ دستنبو اور اس کے چھاپے کا ذکر نہ کیا۔ البتہ اگر تم ذکر کرتے تو وہ دونوں باب میں کچھ فرماتے اور مجھ کو دعا سلام کہ دیتے۔

چونکہ تم نے اپنے خط میں کچھ نہیں لکھا اس سے معلوم ہوا کہ بھائی نے کچھ نہیں کہا۔ اگر انھوں نے کچھ نہیں کہا، تو ان کا ستم۔ اور اگر ان کا کہا تم نے نہیں لکھا، تو تمہارا کرم۔ بہر حال خوب مصرع حافظ کا تم نے یاد دلایا۔ ع

یارب، مباد کس را مخدوم بے عنایت

خواہی تم، خواہی منشی نبی بخش سلمہ اللہ تعالیٰ۔ یہ یاد رہے: یہ مصرع اگر مجھ پر زنجیر سے باندھو گے تو بھی نہیں بندھے گا۔ اگر دستنبو کو سراسر غور سے دیکھو گے تو اپنا نام پاؤ گے اور یہ بھی جانو گے کہ وہ تحریر تمھاری اس تحریر سے سو برس پہلے کی ہے۔

آخر روزِ دوشنبہ ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء

(۴۶)

نورِ نظر و لختِ جگر مرزا تفتہ!

تم کو معلوم رہے کہ رائے صاحب مکرم و معظم رائے امید سنگھ بہادر یہ رقعہ تم کو بھیجیں گے۔ تم اس رقعے کو دیکھتے ہی ان کے پاس حاضر ہوتا اور جب تک وہاں رہیں تب تک حاضر ہوا کرنا اور دستنبو کے باب میں جو ان کا حکم ہو بجا لانا۔ ان کو پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کریں گے، وہ لے لینا۔ جب کتاب چھپ چکے، دس جلدیں رائے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں بموجب ان کے حکم کے میرے پاس ارسال کرنا اور وہ جو میں نے پانچ جلد کی آرائش کے باب میں تم کو لکھا ہے، اس کا حال مجھ کو ضرور لکھنا۔

ہاں صاحب، ایک رباعی میرے سہو سے رہ گئی ہے۔ اس رباعی کو چھاپا ہونے سے پہلے حاشیے پر لکھ دینا۔ جہاں یہ فقرہ ہے: "تے تے، اختر بختِ خسرو در بلندی بہ جائے رسید کہ رخ از خاکیاں نہفت۔"

جائے کہ ستارہ شوخ چشمی ورزد — افر اقسار دگر زن ارزن ارزد

خورشید ز اندیشہ چادر گردش — بر چرخ نہ بینی کہ چساں می لرزد

چونکہ حاشیہ معنی لغات سے بھرا ہوا ہے تو تم اس فقرے کے آگے نشان بنا کر اوپر کے

حاشیے پر رباعی لکھ دینا۔ اور حاشیہ یمین پر جہاں اور معنی لکھے ہوئے ہیں وہاں رباعی کے لغات کے معنی خفی قلم سے لکھ دینا: "افسر"، "افسار"، "گرزن" بہ ہر دو فتحہ" جادر گردش ۔"

نگاشتہ ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء غالب

(۴۷)

صاحب!

عجب تماشا ہے! تمھارے کہے سے منشی شیو نرائن صاحب کو لکھا تھا۔ سو کل ان کا خط آیا تھا اور انھوں نے "دستنبو" کی رسید لکھی۔ ڈاک کا ہر کارہ تو ان کے پاس لے نہ گیا ہو گا۔ آخر تمھیں نے بھیجا ہو گا۔ یہ کیا کہ تم نے مجھ کو اس کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا۔ اگر یہ گمان کیا جائے کہ تم نے رائے امید سنگھ کی ملاقات ہو لینے پر خط کا لکھنا منحصر رکھا ہے تو وہ بھی ہو چکی ہو گی۔ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو۔ کتاب مطبع میں حوالے کر دی۔ اب اس کی تزئین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں۔ پس اگر یوں ہے، تو میں اس کے انطباع سے درگذرا۔ سینکڑوں مطالب و مقاصد رہ جائیں گے۔ اور پھر اس وحشت کی وجہ کیا؟ اگر کہا جائے کہ وحشت نہیں ہے، تو اس کتاب اور مثنوی کی رسید نہ لکھنے کی وجہ کیا! بے تکلف قیاس چاہتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو۔ خدا کے واسطے، خط جلد بھیجو۔ اگر خفا ہو تو خفگی کا سبب لکھو۔

جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے۔ عیاذاً باللہ! میں ان سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ "دستنبو" تم کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔ اگرچہ ایسے حال میں کہ مجھ کو تم پر الگ ہونے اور پہلو تہی کرنے کا گمان گذرا ہے کوئی مطلب تم کو لکھنا نہ چاہیے۔ مگر ضرورت کو کیا کروں؟ ناچار لکھتا ہوں صاحب مطابق نے خط کے لفافے پر لکھا ہے۔

"مرزا نوشہ صاحب غالب"

للہ! غور کرو کہ یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے! ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اول

کتاب پر بھی نہ لکھدیں۔ کیا فارسی کا دیوان یا اُردو یا پنج آہنگ یا 'مہر نیم روز' چھاپے کی کوئی کتاب اس شہر میں نہیں پہنچی، جو وہ میرا نام لکھ دیتے۔ تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت عرف سے، وجہ اس واویلا کی نہیں ہے۔ بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکام کو صرف عرف معلوم ہے۔ مگر کلکتے سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمے میں اور ملکۂ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا ہے، اگر صاحبِ مطبع نے 'مرزا نوشہ صاحب غالبؔ' لکھدیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا! میری محنت رائگاں گئی! گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی! لکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ دیکھوں تم یہ پیام مطبع میں پہنچا دینے ہو یا نہیں؟

بدھ کا دن، ستمبر کی پہلی تاریخ ۱۸۵۸ء

(۴۸)

للہ الشکر، تمہارا خط آیا اور دلِ سودا زدہ نے آرام پایا۔ تم خط میرا اچھی طرح پڑھا نہیں کرتے۔ میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزو میں آ جائے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جزو میں آ جائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔ بہر حال اس نمونے کی تقطیع اور حاشیہ مطبوع ہے۔ لغات کے معنی حاشیے پر چڑھائیں اس کی روش دلآویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔ رباعی حاشیے پر لکھ دی۔ اچھا کیا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب سے نثر کے دو فقرے جس محل پر کہ ان کو بتائے ہیں، ضرور لکھوا دینا۔ میں نے جو تم کو 'میرزائی' کا خطاب دیا ہے ان فقروں میں اس کا اظہار کیا ہے۔

بہت ضروری یہ [illegible] ہے اور میں منشی شیو نرائن صاحب کو آج صبح کو لکھ چکا ہوں تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اول یہ جملہ ہے:

اگر دردم دیگر بہ تہیب میاش ہم زند

تہیب، کی جگہ 'نوائے' بتا دینا!

بہ نوائے میاش ہم زند

تہیب لفظ عربی ہے۔ اگر رہ جائے تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاکو کی

نوک سے نہیب کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ نواے لکھ دیا جائے۔
رائے امید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطبع کی اعانت کی۔ حق تعالیٰ ان کو اس کارسازی اور فقیر نوازی کا اجر دے۔ صاحب کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے۔ اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے۔ اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلوتہی نہ کرو۔ اور بہ دل توجہ فرماؤ۔ کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی کا ہو گیا ہے۔ چھ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبد اللطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں اور تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیونکر کیا چاہیے۔ سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں، تاکہ حرف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھنچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پُر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور صنّاعی اور ہوشیاری ان کی میرے کس دن کام آئے گی!
میرزا نفتہ، تم بڑے بے درد ہو۔ دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں پنجہ بند تو میسّر نہیں، صحّاف اور نقاش کہاں۔ شہر آباد ہوتا، تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔ قصہ مختصر، یہ عبارت منشی عبد اللطیف کو پڑھا دو۔ میں تو ان کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں تو کیا عجب ہے۔ دو روپیہ فی جلد اس سے زیادہ کا مقدور نہیں۔ جب مجھ کو لکھو گے ہنڈوی بھیج دوں گا۔ چھ روپیے۔ آٹھ روپے، دس روپے، حد بارہ روپے میاں کو سمجھا دینا کمی کی طرف نہ کریں۔ چیز اچھی بنے۔ نہایت "۱۲" بس، چھ جلدیں تیار رہوں۔
منشی شیو نراین کو سمجھا دینا کہ تمہارا عُرف نہ لکھیں۔ نام اور تخلص لیں۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب، بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں، نام کے بعد لفظ 'بہادر' کا اور

اسد اللہ خاں بہادر غالب

بھائی، تم نے اوراقِ مثنوی کی رسید نہ لکھی۔ تمہیں وہ پارسل میں سے گر تو نہ گئے ہوں دیکھو کس لطف سے میرے نام کی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اوروں کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے مگر میں اس کی عبارت کیا بتاؤں۔ صاحبِ مطبع اس امر کو اُردو میں، آخرِ کتاب لکھ دیں۔ منشی جی سے نثر لکھوا لو۔ منشی عبداللطیف کو یہ خط پڑھا دو۔ 'نہیب'، کی جگہ، 'نوا'، بنا دو۔ صاحبِ مطبع کو میرا نام بنا دو۔ خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحبِ مطبع سے لکھوا دو۔ برخوردار عبداللطیف سے مقدار روپیے کی دریافت کر کے مجھ کو لکھ بھیجو۔ اپنی مثنوی کی رسید لکھو۔ اپنے بہ جان و دل مصروف ہونے کا اقرار کرو۔ ان سب امور کی مجھے خبر دو۔

جمعہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء۔ ہنگام نیروز غالب

(۴۹)

میرزا تفتہ کو دعا پہنچے!

دونوں فقرے جس محل پر بنائے ہیں، حاشیے پر لکھ دیے ہوں گے 'نہیب' کے نقطہ کو چھیل کر 'نوا'، بنا دیا ہوگا۔ برخوردار منشی عبداللطیف کو میرا خط اپنے نام کا دکھا دیا ہوگا۔ ان کی سعادت مندی سے یقین ہے کہ میری التماس قبول کریں۔ ادر اُدھر متوجہ ہوں۔ کاپی لکھی جاتی اور چھاپا ہونا شروع ہو گیا ہوگا۔ اگر پتھر بڑا ہے تو چاہیے آٹھ آٹھ صفحے بلکہ بارہ بارہ صفحے چھاپے جائیں اور کتاب جلد منطبع ہو جائے۔ بھائی، منشی صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضرور نہیں، مجھ پر مہربان اور حسنِ کلام کے قدردان ہیں۔ اس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے تو کیا میری تفضیح کے روادار ہوں گے؟ بھائی تم نے بھی اور منشی ہیونراین صاحب نے بھی لکھا میں ایک عبارت لکھتا ہوں، اگر پسند آئے تو خاتمۂ کتاب میں چھاپ دو:

"نامہ نگار، غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ جو میری سرگذشت کی داستان ہے اس کو میں نے مطبع مفید خلائق میں چھپوایا ہے اور

میری رائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبان
مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں
اس کے چھاپنے پر جرأت نہ کریں۔"

اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور رہو، تو منشی شیو نرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔ یہ سب باتیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، اب دو امر ضروری الاظہار تھے اس واسطے یہ خط لکھا ہے۔ ایک تو ارددعبارت دوسرے یہ کہ میرے شفیق مکرم سید محمد حسین صاحب کا خط میرے نام آیا ہے اور انھوں نے ایک بات جواب طلب لکھی ہے۔ اس کا جواب اس خط میں لکھتا ہوں۔ تم کو چاہیے کہ ان سے کہدو بلکہ یہ عبارت ان کو دکھا دو:

"بندہ پرور، نواب عطاء اللہ خاں میرے بڑے دوست
اور شفیق ہیں۔ ان کے فرزند رشید میر غلام عباس المخاطب بہ
سیف الدّولہ: یہ دونوں صاحب صحیح و سالم ہیں۔ شہر سے باہر
دو چار کوس پر کوئی گانو ہے، وہاں رہتے ہیں۔ شہر میں اہلِ اسلام
کی آبادی کا حکم نہیں، اور ان کے مکانات قرق ہیں۔ نہ ضبط ہو گئے
ہیں، نہ واگزاشت کا حکم ہے۔"

(۵۰)

مشفق میرے، مکرم فرما میرے!

تمہارا خط اور تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ شاید میرے دکھانے کے واسطے بھیجے گئے ہیں۔ ورنہ رسم تو یوں ہے کہ پہلے صفحے پر کتاب کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحے پر لوح سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس کا بھی چھاپا اسی طرح ہو گا۔ غرض کہ تقطیع اور شمار سطور اور کاپی کا حسن خط اور الفاظ کی صحت، سب میرے پسند، صحتِ الفاظ کا کیا کہنا ہے۔ واللہ! بے مبالغہ کہتا ہوں۔ اگر بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر

احیاناً اصل نسخے میں سہوِ کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو، تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ تم میری طرف سے ان کو سلام کہنا بلکہ یہ خط دکھا دینا۔ خدا کرے انجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔ جدول کبھی مطبوع ہے۔ پہلے صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب ہو گی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ "فرنچ" کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذرِ حکام ہیں وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو "شیو رام پوری" پر اور چاہو نیلے کاغذ پر چھاپو۔ اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں وہ اُس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی "شیو رام پوری" پر یا نیلے کاغذ پر۔ یہ تکلف محض ہے یہاں کے حاکموں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کے نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر نہ ہوں مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ زاید پڑتا ہو تو خیر دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں "شیو رام پوری" پر ہوں۔ باقی جلدوں میں تمھیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب! اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور درخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔ آگے اس سے میں نے برخوردار منشی عبد اللطیف کو لکھا تھا کہ ان چھ کتابوں کی کچھ تزئین اور آرائش کی فکر کریں۔ معلوم نہیں، تم نے وہ پیام ان کو پہنچایا یا نہیں۔ آپ اور منشی عبد اللطیف اور مرزا حاتم علی صاحب مہر باہم صلاح کریں۔ اور کوئی بات خیال میں آوے تو بہتر، ورنہ ان چھ نسخوں کی جلدیں انگریزی ڈیڑھ، ڈیڑھ، دو دو روپے کی لاگت کی بنوا دینا اور اس کا روپیہ تیاری سے پہلے مجھ سے منگوا لینا۔

"آنکہ ہمہ را دریک دم بہ نوید بشنو پدید آورد اگر در دم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند الخ۔"

اس میں نہیب کا نقطہ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہوِ کاتب سے رہ گیا ہے اس کو تیز چاکو سے چھیل کر "بہ نوائے" لکھ دینا یعنی:

بہ نوائے مباش بہم زند

ضرور ضرور۔ اس کا انتظار نہ کیجو کہ جب یہاں چھاپا آئیگا تو بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے نہ چھاپے میں غلط ہو۔ اگر اجزائے اصل نیر امیر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں، تو ان کو یا بھائی منشی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوا دینا۔

روز شنبہ۔ ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء از غالب

(۵۱)

اچھا، میرا بھائی "تہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں یا نسو ہوں، سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو، وہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمی ہو جائیگی اور میرے کمال کو دھبّا لگ جائیگا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہرچند مسودے میں بنا دیا تھا لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔

لکھتے ہو کہ مرزا صاحب دو جلدیں درست کرینگے۔ یہ تو صورت اور ہے۔ یعنی میں نے چھ جلدیں بارہ روپیہ کی لاگت میں بکار سازی و ہنر پردازی برخوردار منشی عبد اللطیف چاہی تھیں۔ منتظر تھا کہ اب ان کا قبول کرنا مجھ کو لکھو گے اور روپیہ مجھ سے منگواؤ گے۔ ظاہرا عبد اللطیف نے پہلو تہی کیا۔ مرزا صاحب اگر کفیل تھے تو چھ جلدیں بنواتے نہ کہ دو۔ البتہ اس احتمال کی گنجائش ہے کہ دو بہت پُر تکلف اور چار بہ نسبت اس کے کچھ کم۔ اگر یوں ہے تو یہ تو مدعائے دلی میرا ہے۔ مگر اطلاع ضرور ہے۔

رائے امید سنگھ کے نام کا خط بہ احتیاط رہنے دو۔ جب وہ آئیں، ان کو دے دو۔ یہ جو تم لکھتے ہو کہ "تہیب" کا لفظ لکھ دیا گیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھاپا شروع ہو کر دور تک پہنچ گیا۔ کیا عجب ہے کہ کتابیں جلد منطبع ہو جائیں۔

ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں۔ نیرزہ الفتنہ سنو: ان دنوں میں میرے محسن حکیم احسن اللہ خاں "آفتاب عالمتاب"

کے خریدار ہوئے ہیں اور ہیں اُنہی کے بموجب ان کے لکھنے کے برادر دیتی مولانا مہر کو لکھا ہے۔
حضرت نے لاوتمام جواب میں نہیں لکھا۔ تم ان سے کہو کہ وہ ستمبر ۱۸۵۸ء سے خریدار ہیں۔
آج ۱۶ ستمبر کی ہے۔ دوسرا اخبار کے حکیم صاحب کے نام کا سرنامہ "خان چند کے کوچے۔"
کا پتا لکھ کر روانہ کریں۔ آیندہ ہفتہ بہ ہفتہ بھیجے جائیں۔ اور حکیم احسن اللہ خان کا
نام خریداروں میں لکھ لیں۔ دوسرے اخبار مذکور میں ایک صفحہ، ڈیڑھ صفحہ
بادشاہِ دہلی کے اخبار کا ہوتا ہے جس دن سے وہ اخبار شروع ہوا ہے اس دن
سے صرف اخبارِ شاہی کا صفحہ نقل کر کے ارسال کریں۔ کاتب کی اجرت اور کاغذ
کی قیمت یہاں سے بھیج دی جائے گی۔ بھائی، تم مرزا صاحب سے اس کو کہہ کر
جواب لو اور مجھ کو اطلاع دو۔ تہذیب کے تہذیب سے مرا جاتا ہوں۔ اس کی درستی
کی خبر بھیجو۔ باقی جو چھاپے کے حالات ہوں اس کی آگہی ضرور ہے۔

پنج شنبہ۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۵۲)

بھائی!

مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔ آج صبح کو ایک خط بھیج چکا
ہوں۔ اب اس وقت تمہارا خط اور آیا۔ سنو صاحب، لفظِ مبارک 'میم، حا، میم، دال'،
اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے۔ مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں
یہ لفظ یعنی 'محمد اسد اللہ خان' نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا
'میرزا'، 'مولانا'، 'نواب'، اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے۔ جو چاہو، سو لکھو۔
بھائی کو کہنا: ان کے خط کا جواب صبح کو روانا کر چکا ہوں۔
میرزا تفتہ! اب تم نئی تزئین جلد ہائے کتاب کے باب میں برادرزادۂ سعادتمند
کو تکلیف نہ دو۔ مولانا مہر کو اختیار ہے، جو چاہیں سو کریں۔
خط تمام کر کے خیال میں آیا کہ وہ جو مرزا صاحب سے مجھ کو مطلوب ہے، تم
پر بھی ظاہر کر دوں۔ صاحب، وہاں ایک اخبار موسوم بہ 'آفتابِ عالمتاب' نکلتا ہے۔

اس کے مہتمم نے التزام کیا ہے کہ ایک صفحہ یا ڈیڑھ صفحہ بادشاہِ دہلی کے حالات کا لکھنا ہے۔ نہیں معلوم، آغاز کس مہینے سے ہے! سو حکیم احسن اللہ خاں یہ چاہتے ہیں کہ سابق کے جو اوراق ہیں، جب سے ہوں، وہ جو چھاپے خانے میں مسودہ رہتے ہیں۔ اس کی نقل کسی کاتب سے لکھوا کر یہاں بھیجی جائے۔ اجرت جو لکھی آئیگی، وہ بھیجی جائیگی اور ابتدائے ۱۸۵۸ء سے ان کا نام خریداروں میں لکھا جائے۔ دو ہفتے کے دو لیبر ان کو ایک لفافے میں بھیج دیئے جائیں اور پھر ہر مہینے ہفتہ در ہفتہ ان کو لفافہ اخبار کا پہنچا کرے۔ یہ مراتب جناب مرزا حاتم علی صاحب کو لکھ چکا ہوں، اور اب تک آثارِ قبول ظاہر نہیں ہوئے، نہ لفافے حکیم صاحب کے پاس پہنچے، نہ ان صفحات کی نقل میرے پاس آئی۔ آپ کو اس میں سعی ضرور ہے۔ اور ہاں صاحب، "آفتابِ عالمتاب" کا مطبع تو "کشمیری بازار" میں ہے، مگر آپ مجھ کو لکھیں کہ "سقیدِ خلایق" کا مطبع کہاں ہے؟ عجب ہے کہ ان صاحب شفیق نے میری تحریرات کا جواب نہیں لکھا۔ فرمایش حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی بہت اہم ہے، عند الملاقات میرا اسلام کہہ کر اس کا جواب، بلکہ وہ اخبار ان سے بھجواؤ۔

جمعہ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۳)

بھائی!

آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضا کے شکوہ آمیز خط جناب میرزا صاحب کی خدمت میں لکھ کر بھیجا۔ کہاں خط ڈاک میں ڈال کر آیا ہی تھا کہ ڈاک کا ہرکارا ایک خط تمہارا اور ایک خط مرزا صاحب کا لایا۔ اب کیا کروں؟ خیر چپ ہو رہا۔ شکوہ محبت بڑھائیگا۔ مرزا صاحب کی عنایت کا شکر بجالاتا ہوں۔ یقین ہے کہ جلد یں میرے خاطر خواہ بن جائیں گی کس واسطے کہ جو آج کے خط میں انھوں نے لکھا ہے، وہ بعینہ میرا مکنون ضمیر ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے، میرا سلام کہہ دینا۔ ان کے خط کا جواب کل پرسوں بھیجوں گا۔

راے امید سنگھ بہادر خوبان روزگار میں سے ہیں۔ فقیر کا سلام نیاز اُن کو کہہ دینا۔ خدا کرے ان کے سامنے کتابیں چھپ چکیں۔ بارے جب وہ گوالیار کو تشریف لے جائیں، تو مجھ کو اطلاع لکھنا۔ "نہیب" کے "نوائے" بن جانے سے خاطر جمع ہو گئی۔ بھائی، میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب ان احتراز کا جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے علم اس کا غیاث الدین رامپوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق ان اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔ آگے اس سے تم کو بھی اور بھائی کو بھی لکھ چکا ہوں، اب صرف اس تحریر کا اشارہ لکھنا منظور تھا۔ آج جس طرح مجھ کو تمھارا اور مرزا صاحب کا خط پہنچا، لازم تھا کہ حکیم صاحب کو بھی لفافۂ اخبار پہنچ جاتا۔ مگر اس وقت تک نہیں پہنچا۔ اور یہ دوپہر کا وقت ہے۔ خیر، پہنچ جائیگا۔ میں نے تمھارا خط ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ انھوں نے تمھاری راے منظور کی۔ اب تم وہ اخبار جس طرح کہ تم نے لکھا ہے، ان کے پاس بھیج دو؛ اور صاحب مطبع قیمت اخبار اور اجرت کاتب ان کو لکھ بھیجے۔ اپنے نام اور مسکن سے ان کو اطلاع دیدو۔ بس اس کو اپنے طور پر روپیہ بھیج دینگے۔ ہم تم واسطۂ شناسائی ہمدگر ہو گئے۔ ہاں اگر احیاناً روپے کے بھیجنے میں دیر ہو گی، تو میں کہہ کر بھجوا دونگا۔ یہ البتہ میرا ذمّہ ہے۔

۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۴)

صاحب۔

قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مطبع نے بھی مجھ کو دی ہے خدا ان کو سلامت رکھے۔ کل مرزا صاحب کے خط میں ان کو ایک مصرع کسی استاد کا لکھ چکا ہوں۔ میں سراسر ان کا ممنون احسان ہوں۔ میرا سلام کہنا اور لفافۂ اخبار کے پہنچنے کی اطلاع دینا۔ میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں جاتا۔ خدا

جانے اس پر کیا بجوگ پڑا؟ ظاہرا انھوں نے پوسٹ پیڈ بھیجا ہوگا۔ پھر پوسٹ پیڈ بھی کیوں تلف ہو؟

"شیہہ" بہ معنی صدائے اسپ، لغت فارسی ہے۔ بہ شین مکسور و یائے معروف و ہائے ہوز مفتوح و ہائے ثانی زدہ اور عربی میں اس کو "صہیل" کہتے ہیں۔ صیہہ کوئی لغت نہیں ہے، عربی نہ فارسی۔ اگر غنیمت کے کلام میں 'صیہہ' لکھا ہے تو کاتب کی غلطی ہے۔ غنیمت کا کیا گناہ؟

درخور زروے بتر سہ گاہے شمار یافت

اصل مصرع یوں ہے۔ میں نے سہو سے "خدا جانے" کیونکر لکھ دیا ہے۔ بھائی "دہر خواں" کے دو معنی ہیں۔ ایک تو خطاب، کہ جو سلاطین امرا کو دیں اور دوسرے وہ نام جو لڑکوں کا پیار سے رکھیں یعنی عرف حاشیے پر شوق سے لکھوا دو۔ مگر تم نے دیکھا ہوگا کہ اس عبارت سے جو تمھارے ذکر میں ہے پہلے "دہر خواں" کے معنی حاشیے پر چڑھ گئے ہیں۔ مکرر لکھنے کی حاجت کیا ہے؟ بھائی صاحب کیوں مضائقہ فرمائیں۔ حال اوراق کی تحریر کا معلوم ہوا۔ صاحبانِ کونسل کی رائے ولایتِ آگرہ یعنی میرے محکمے میں منظور و مقبول۔ نام میرا جس طرح چاہو لکھ دو۔

بنام آں کہ او نامے ندارد   بہر نامے کہ خوانی سر بر آرد

شفیق با تحقیق مولانا مہر ذرّہ بیمقدار کا سلام قبول کریں۔ کل آپ کو خط لکھ چکا ہوں۔ آج یا کل پہنچ جائیگا۔ رات سے ایک بات اور خیال میں آئی ہے۔ مگر چونکہ تحکم و کارفرائی ہے۔ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہونگی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہونگی، ان کی صورت یہی ٹھہرتی ہے کہ بیاہ قلم کی لوح اور انگریزی کی جلد۔ کیوں بھائی صاحب! قرار داد اور تجویز یہی ہے۔ اور پھر سمجھا چاہیئے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں۔ نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ کیا میری بد وضعی

کہ جناب اڈمنشٹن صاحب کی نذر نہ بھیجوں! آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت
بھیجونگا۔ نہ صاحب، ایک جلد ان کی نذر بہت ضروری ہے۔ آپ گنجایش نکال کر
جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں ایک اور بھی ایسی ہی بنوائیں یقین ہے کہ آپ
اس رائے کو پسند فرمائینگے اور چار کی جگہ پانچ بنوائینگے ۔ یہ عرض مقبول اور
یہ گستاخی، کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔

بھائی مرزا تفتہ، کل کے مرزا صاحب کے خط میں سے اس مادۂ تاریخ کا
قطعہ لکھ لینا۔ تم کو لکھ چکا ہوں ایک قطعہ مرزا صاحب کا، ایک قطعہ تمھارا بلکہ
ایک قطعہ مولانا حقیر سے بھی لکھواؤ۔

صبح پنج شنبہ۔ سی ام ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۵)

...ول صاحب!

اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی؟
نہ مرزا صاحب ہی آئے۔ نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں ایک بار منشی شیو
نرائن نے کرم کیا تھا اور خط میں یہ رقم کیا تھا کہ اب ایک فرما باقی رہا ہے۔
اس راہ سے میں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اگر ایک فرما نثر کا باقی تھا تو اب قصیدہ
چھاپا جاتا ہوگا اور اگر فرما قصیدے کا تھا تو اب جلدیں بندھنی شروع ہوگئی ہونگی۔

تم سمجھے؟ میں تمھارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا
حاتم علی صاحب کے خطوط آنے کو تمھارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا
وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے اور اب کیا
دیر ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے! بھائی صاحب کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہوگئی
مرزا صاحب نے جلدیں صحاف کو دے دیں؟ میں اب ان کتابوں کا آنا کب
تک تصور کروں؟ دسہرے میں ایک، دو دن کی تعطیل مقرر ہوئی ہوگی۔
کہیے ... کی تعطیل ... نوبت ... پہنچ ...

ہاں صاحب، تم نے کبھی کچھ حال قمرالدین خان صاحب کا نہ لکھا۔ آگے اس سے تم نے اگست، ستمبر میں ان کا آگرے کا آنا لکھا تھا۔ پھر وہ اکتوبر تک کیوں نہ آئے وہاں تو منشی غلام غوث خاں صاحب اپنا کام بدستور کر تے ہیں۔ پھر یہ اس دفتر میں کیا کر رہے ہیں؟ کہیں کسی اور کام پر معین ہو گئے ہیں؟ اس کا حال جلد لکھو۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ تم نے لکھا تھا کہ منشی غلام غوث خان صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے۔ مولوی قمرالدین خان صاحب اس کے بند وبست کو گیا چاہتے ہیں۔ اس کا ظہور کیوں نہ ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب جلد لکھیے۔

جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیام کہیے کہ کتاب کا حسن کانوں سے سنا۔ دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا۔ مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر۔ اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملیگا۔

بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی توجہ کو جلدی نہیں ہے، آپ کی تخفیفِ تصدیع چاہتا ہوں۔ یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے، تو آپ کو آرام ہو جائے۔

جناب منشی شیو نرائن صاحب کی عنایتوں کا شکر میری زبانی ادا کیجیے گا اور یہ کہیے گا کہ آپ کا خط پہنچا۔ چونکہ میرے خط کا جواب تھا اور معہذا کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اس واسطے اس کا جواب نہیں لکھا۔ زیادہ۔ زیادہ۔

نگاشتہ و روال داشتۂ صبح شنبہ ۱۶ر اکتوبر ۱۸۵۸ء

راقم غالب

(۵۶)

اللہ اللہ! ہم تو کول سے تمھارے خط کے آنے کے منتظر تھے۔ ناگاہ کل جو خط آیا، معلوم ہوا کہ دو دن کول میں رہ کر سکندرآباد آگئے ہو، اور وہاں سے تم نے خط لکھا ہے۔ دیکھیے اب یہاں کب تک رہو اور آگرے کب تک جاؤ۔ برسوں

برخوردار شیو نرائن کا خط آیا تھا۔ لکھتے تھے کہ کتابوں کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے اب قریب ہے کہ بھیجی جائیں۔ مرزا مہر بھی ایک ہفتہ بتاتے ہیں۔ دیکھیے کس دن کتابیں آجائیں۔ خدا کرے سب کام دلخواہ بنا ہو۔

ہاں صاحب، منشی بال مکند بیصبر کے ایک خط کا جواب ہم پر قرض ہے۔ میں کیا کروں؟ اس خط میں انھوں نے اپنا سیر و سفر میں مصروف ہونا لکھا تھا۔ پس میں ان کے خط کا جواب کہاں بھیجتا؟ اگر تم سے ملیں تو میرا سلام کہہ دینا۔ اور مطبع آگرہ سے کتابوں کا حال تو تم خود دریافت کر ہی لو گے۔ میرے کہنے اور لکھنے کی کیا حاجت؟

چہار شنبہ۔ سوم نومبر ۱۸۵۸ء

(۵۷)

کیوں صاحب۔

کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندرآباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندرآباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جائے۔ بہر حال۔

کس بشنود یا نشنود، من گفتگوے می کنم

کل جمعہ کے دن ۱۲ ر تاریخ نومبر کو تینتیس ۳۳ جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیو نرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا، سب خوب! دل خوش ہوا۔ اور شیو نرائن کو دعا دی۔ سات کتابیں جو مرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں وہ بھی یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔ معلوم نہیں منشی شیو نرائن نے اندور کو واسطے راے امید سنگھ کے، کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں!

صاحب، تم اس خط کا جواب جلد دو اور اپنے قصد کا حال لکھو سکندرآباد کب تک رہو گے؟ آگرے کب جاؤ گے۔

شنبہ ۱۳ ر نومبر ۱۸۵۸ء۔ جواب طلب

(۵۸)

آج پنجشنبہ کے دن ۱۸ ر نومبر کو تمہارا خط آیا اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمہارا خط پہنچتا ہے اور میرا خط نہیں پہنچتا۔ میرے خط کے نہ پہنچنے کی دلیل یہ ہے کہ تم نے اصلاحی غزل کی رسید نہیں لکھی۔ میں نے کتب کا پہنچنا تم کو لکھا تھا اس کا تم نے ذکر نہ لکھا صاحب تینتیس ۳۳ کتابیں پہنچ گئیں اور تقسیم ہو گئیں۔ سات کتابیں مرزا مہر کی بھیجی ہوئی موافق ان کی تحریر کے آج شام تک اور مطابق منشی شیو نراین کی اطلاع کے کل تک میرے پاس پہنچ جائینگی۔ اور یہی منشی شیو نراین نے اندور کی کتابوں کی روانگی کی اطلاع دی ہے۔

منشی نبی بخش صاحب تمہارے خط نہ لکھنے کا بہت گلہ رکھتے ہیں۔ شاید میں تم کو لکھ بھی چکا ہوں۔ میر قاسم علی صاحب کی بدنی کا حال معلوم ہوا۔ یہ میرے بڑے دوست ہیں۔ دلی ان دنوں میں آئے تھے۔ مجھ سے مل گئے ہیں ان کو ایک کتاب ضرور بھیج دیتا۔

بھائی۔ میں ہرگز نہیں جانتا کہ میر بادشاہ دہلوی کون ہیں اور پھر ایسے کہ جو کہیں کے مصنف ہوں۔ کچھ ان کے خاندان کا حال اور ان کے والد کا نام لکھو تو میں غور کروں، ورنہ میں تو اس نام کے آدمی سے آشنا نہیں ہوں۔

پنج شنبہ ۱۸ ر نومبر ۱۸۵۸ء - وقت دوپہر

(۵۹)

برخور دار۔

تمہارا خط پہنچا۔ اصلاحی غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ مقطع اب اچھا ہو گیا۔ رہنے دو۔ کل جمعہ کے دن ۱۹ ر نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا مولانا مہر کا پہنچا۔ زبان نہیں، جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرائش ہے، آفتاب کی سی نمائش ہے۔ مجھے یہ فکر کہ کہیں ان کا روپیہ نیاری میں صرف نہ ہوا ہو۔ اچھا میرے بھائی اس کا حال جو تم کو معلوم ہو، مجھ کو لکھ بھیجو۔

رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری مرضی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب، مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔

ببر یا دشاہ کی اور اپنی ناشناسائی آگے تم کو لکھ چکا ہوں۔ اب تمہارے اس خط سے معلوم ہوا کہ وہ تمہارے اور راماؤ سنگھ کے آشنا ہیں۔ کچھ ان کے خاندان کا نام و نشان دریافت ہو، تو مجھ کو بھی لکھ بھیجو، تاکہ میں جانوں کہ یہ کس گروہ میں سے ہیں۔

میاں وہ "راست دروغ بہ گردن راوی" نے مجھ کو بہت پریشان کیا ہے واسطے خدا کے جو راوی نے روایت کی ہے وہ مجھ کو ضرور لکھو اور "تاج گنج" کے رہنے والوں کی ابتری کی حقیقت سے بھی اطلاع دو۔ حکم عفوِ تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلاتِ حرب وپیکار دے کر توقیعِ آزادی پاتے ہیں۔ یہ دو شخص کیسے مجرم تھے، جو مقید ہوئے؟

محرّرہ صبح شنبہ۔ ۲۰، نومبر ۱۸۵۸ء

(۶۰)

میرزا تفتہ۔

تمہارا خط آیا فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا۔ خدا فضل کرے۔ اگر تم اس راز کے اظہار کو منع نہ کرتے تو بھی میرا شیوہ ایسا لغو نہیں ہے کہ میں ان کو لکھتا۔ لکھتے ہو کہ مرزا مہر کے دو چار روپیے زاید صرف ہو گئے تو کیا اندیشہ ہے۔ حال یہ ہے کہ میں نے ان سے استفسار کیا تھا۔ انھوں نے مجھ کو لکھا کہ کتابوں کی درستی میں وہی بارہ روپیے صرف ہوئے ہیں، محصول کی ایک رقم خفیف اگر میں نے اپنے پاس سے دی۔ تو اس کا کیا مضائقہ۔ مجھ کو تمہارا قول مطابق واقع نظر آتا ہے البتہ ان کے دو تین روپیے اٹھ گئے ہوں گے۔

لالہ گنگا پرشاد "شاد" تخلص اپنے کو تمہارا شاگرد بتاتے ہیں شعر ریختہ کہتے ہیں کئی دن ہوئے کہ یہاں آئے اور یہاں کئی بیٹھکیں قرینہ اصلاح کو لائے۔ وہ

دیکھ کران کو حوالے کر دیں۔

ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ ان کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی ہے۔ میں نے اب ایک کتاب 'سادہ بے جلد' ان کو بھیجی تھی۔ کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے۔ اور ہاں بھئی ایک تماشا اور ہے۔ وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ 'دستنبو' پہلے اس سے کہ تم بھیجو 'مطبع مفید خلایق' نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمھارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ ان کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سکرٹروں کی نذر بہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانا ہو جائینگے دیکھو چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں۔

تا نہالِ دوستی کے بر دہد حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

شنبہ ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء

(۶۱)

صاحب۔

تمھارا خط آیا۔ میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا۔ تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟

وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے۔ وہ حکیم سنائی کا ہے اور وہ نقل "حدیقہ" ...

پسرے باپدر بزاری گفت   کہ مرا یار شو بہ ہمرہ مجفت
گفت بابا زنا کن و زن نے   پند از خلق گیرو از من نے
در زنا گر بگیر دت عسسے   بہلد کو گرفت چوں تو بسے
زن کنی ہر گزت رہا نکند   ور تو بگزاریش چہا نکند

بس تو اب تم سکندر آباد میں رہے۔ کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو؛ اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو، تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو، تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدؔل خوب کہتا ہے ؎

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام؟   زیں ہوسہا بگذر، یا مگذر، می گزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقیّد؛ نہ رنجور ہوں نہ تندرست؛ نہ خوش ہوں نہ ناخوش؛ نہ مردہ، نہ زندہ، جیے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہے گاہے پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئیگی، مر رہونگا، نہ شکر ہے، نہ شکایت ہے۔ جو تقریر ہے، بہ سبیل حکایت ہے بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔

یکشنبہ ۱۹، دسمبر ۱۸۵۸ء

(۶۲)

کیوں صاحب!

روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آرہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو، دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے

ایک دو صبح کو اور ایک، دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب؟ دس، دس، بارہ، بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔ یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو، صاحب۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے، تو بیرنگ بھیجو۔

سوموار۔ ۲۷، دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۶۳)

دیکھو صاحب۔ یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔ لطف اس میں یہ ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔

آج تک رائے امید سنگھ یہیں ہیں اور ابھی نہیں جائینگے۔ تمہارا مدعا حاصل ہو گیا ہے جس دن وہ آئے تھے اسی دن مجھ سے کہہ گئے تھے۔ میں بھول گیا اور اس خط میں تم کو نہ لکھا۔ صاحب وہ فرماتے تھے کہ میں نے کئی مجلد مرزا تفتہ کے دیوان کے اور کئی نسخے "تضمین اشعار گلستان" کے ان کی خواہش کے بموجب کوئی پارسی ہے بمبئی میں، اس کے پاس بھیج دیئے ہیں یقین ہے کہ وہ ایران کو ارسال کریگا۔ امید سنگھ نے اس پارسی کا نام بھی لیا تھا۔ میں بھول گیا۔ اب جو تم کو اس خیال میں مبتلا پایا، تو ان کا بیان مجھ کو یاد آیا۔ جانتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ دو بار ان کے گھر گیا بھی ہوں، مگر محلے کا نام نہیں جانتا، نہ میرے آدمیوں میں کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر تم کو لکھ بھیجونگا۔

میر بادشاہ صاحب سے عندالملاقات میری دعا کہہ دینا

لاحول ولا قوۃ الا باللہ! لکھنے کے قابل بات پھر بھول گیا۔ کل میر کرامت علی صفا تخلص، کہ میں نے آگے کبھی ان کو نہیں دیکھا تھا ناگاہ مجھ سے آکر ملے اور تمہارا حال پوچھتے رہے میں نے کہہ دیا کہ بخیر و عافیت سکندرآباد میں ہیں۔ جب میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ تمہارے آشنا ہیں۔ انھوں نے کہا: صاحب وہ میرے بزرگ

اور استاد ہیں ۔ میں ان کا شاگرد ہوں ۔ کہیں مدرسے کے علاقے میں نوکر ہیں
بہ سبیل ڈاک آئے تھے اور آج بہ سبیل ڈاک انبالے کو گئے ۔ انبالہ ان کا وطن ہے
اور نوکر بھی وہ اسی ضلع میں ہیں ۔

نگاشتۂ دوشنبہ ۔ ۳ ، جنوری ۱۸۵۹ء غالبؔ

(۶۴)

صاحب ۔

تمھارا خط مع رقعۂ سخن فہم پہنچا ۔ تمھاری خوشامد نہیں کرتا ۔ سچ کہتا ہوں کہ
تمھارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے ۔ جواب
میں درنگ اس راہ سے ہوئی کہ میں مصطفیٰ خاں کی ملاقات کو بہ سبیل ڈاک
میرٹھ گیا تھا ۔ تین دن وہاں رہا ۔ کل وہاں سے آیا ، آج تم کو یہ خط بھجوایا ۔

محررہ ومرسلۂ چہارشنبہ ۲۶ ، جنوری ۱۸۵۹ء غالبؔ

(۶۵)

صاحب !

میرٹھ سے آ کر تم کو خط لکھ چکا ہوں ۔ شاید نہ پہنچا ہو ۔ اس واسطے از روے
احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خان کے ملنے کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا اور سہ شنبہ
کے دن دلی آ گیا اور چارشنبہ کے دن تم کو خط بھیجا ۔

کل آخر روز راجہ امید سنگھ بہادر میرے گھر آئے تھے ۔ تمھارا خط ان کے دکھانے
کو رکھ چھوڑا تھا ۔ وہ ان کو دکھایا ۔ پڑھ کر یہ فرمایا کہ کسی اور مندر میں قصد
اقامت نہیں ہے ۔ بنا ایک تکیہ بنایا چاہتا ہوں ۔ آدمی بندرابن گئے ہیں ، کوئی مکان
مول لینگے ۔ وہاں اپنی وضع پر رہونگا ۔ میرا سلام لکھنا اور یہ پیام لکھنا کہ آپ کا کلام
بمبئی تک پہنچ گیا ، اب طہران کو بھی روانا ہو جائے گا ۔

سوادِ ہند گرفتی بہ نظمِ خود تفتہ بیا کہ نوبتِ شیراز و وقتِ تبریز است

صبح یک شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۹ء

(۶۶)

صاحب ۔

تم اچھے خاصے عارف ہو اور تمھارا کشف سچا ہے۔ میں راہ دیکھ رہا تھا کہ تمھارا خط آئے، تو جواب لکھوں۔ کل تمھارا خط شام کو آیا، آج صبح کو جواب لکھا گیا۔ بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلّے کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر پتا محلے کا نہیں ہوتا اور انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانتے ان کی بلا کہ "بلی ماروں کا محلہ" کیا چیز ہے۔ وہ تو بہ نسبت میرے بہت بڑے آدمی ہیں۔ سیکڑوں خط انگریزی ہر روز ان کو آتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے پھر ان کے پاس آدمی بھیجا اور آپ کا خط اپنے نام کا بھیج دیا۔ انھوں نے میرے آدمی سے کہا کہ نواب صاحب کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ میں اس کا کیا جواب لکھوں۔ محلے کا پتہ آپ ہی لکھ بھیجیے۔ سو میں پہلے ابر واقعی تم کو لکھ کر تمھاری خواہش کے موافق لکھتا ہوں۔ ان کے مکان کا پتہ: "بلی ماروں کا محلہ، دستوں کا کوچہ"۔

'دستنبو' کا حال یہ ہے کہ میں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈوی بھیج کر بارہ جلدیں اور ایک جنتری اُن سے منگوائی۔ پھر ان کو اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو انھیں کے ہاتھوں وہیں سے بھجوائیں۔ اور اس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھجوا کر دو جلدیں وہیں سے 'سردھنے' کو بھجوائیں غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور ان سے لے چکا ہوں۔ مگر نقد۔ ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائی ہیں۔ ایک بار ہنڈوی اور دو بار ٹکٹ بھیج چکا ہوں۔ تم کو میری جان کی قسم، سہل طور پر ان کو لکھ بھیجنا کہ غالب نے کتنی کتابیں منگوائی ہیں اور نقد منگوائی ہیں یا قرض اور جو وہ لکھیں، مجھ کو لکھ بھیجنا۔

شنبہ ۱۹، فروری ۱۸۵۹ء
غالب

(۶۷)

صاحب ۔

تمہارا خط آیا۔ دل خوش ہوا۔ تمہاری تحریر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تم کو اگرے سے کتابوں کا منگوانا بے ارسالِ قیمت مظنون ہے۔ چنانچہ حق التصنیف تم نے لکھا ہے۔ بھائی کیا میں تم کو چھوڑ لکھوں گا؟ اور شیونراین نے اگر ذکر ارسال قیمت کا نہیں لکھا تو یہ بھی تو نہیں لکھا کہ بے ارسالِ قیمت منگوائی ہیں۔ تم کو میرے سر کی قسم اور میری جان کی قسم، شیونراین سے اتنا پوچھو کہ اس پچاس جلد کے بعد کے جلدیں غالب نے اور منگوائیں؛ اور قیمت بھیج کر منگوائیں، یا قیمت اس سے لینی ہے۔ دیکھو، میں نے قسم لکھی ہے، یوں ہی عمل میں لانا۔

رائے امید سنگھ صاحب یہیں ہیں۔ مجھ سے ان دنوں میں ملاقات نہیں ہوئی۔ جو تمہارے خط کا ذکر آتا، یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ اور یہ جو تم نے مجھ کو لکھا تھا کہ اگر "دستوں کا کوچہ" نہ ملیگا، تو وہ خط تیرے پاس آئیگا، سو وہ میرے پاس نہیں آیا۔ صاحب، تم کو وہم کیوں ہے؟ ایک امیر نامور آدمی ہے، اس کے نام کا خط کیوں نہ پہنچیگا۔

(۶۸)

اجی مرزا تفتہ ۔

بھائی منشی نبی بخش صاحب کو تمہارے حال کی بڑی پرسش ہے۔ تم نے ان کو خط لکھنا کیوں موقوف کیا ہے؟ وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ اگر آپ کو مرزا تفتہ کا حال معلوم ہو تو مجھ کو ضرور لکھیے گا۔

یک شنبہ ۲۷، فروری ۱۸۵۹ء　　　　　غالب

(۶۹)

کیوں مرزا تفتہ۔ تم بے وفا، یا میں گناہگار۔ یہ بھی تو مجھ کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو! ابھی ایک صاحب میری ملاقات کو آئے تھے۔ تقریباً تمہارا ذکر درمیان آیا۔ وہ کہنے لگے کہ وہ کول میں ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ خط کول بھیجوں، یا سکندرآباد۔ اگر کول بھیجوں، تو مسکن کا پتہ کیا لکھوں؟ بہرحال سکندرآباد بھیجتا ہوں۔ خدا کرے

پہنچ جائے۔ تمہارا دیوان بہ طریق پارسل میرے پاس آیا۔ میں نے ہرکارے کو راجہ امید سنگھ بہادر کے گھر کا پتا بتا کر وہاں بھجوا دیا۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ پانچ چار دن سے سنتا ہوں کہ وہ متھرا اور اکبرآباد کی طرف گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر نہیں گئے۔ بہر حال اس خط کا جواب جلد لکھو اور ضرور لکھو۔

بھائی تم سیاح آدمی ہو۔ جہاں جایا کرو مجھ کو لکھ بھیجا کرو کہ میں وہاں جاتا ہوں یا جہاں جاؤ، وہاں سے خط لکھو۔ تمہارے خط کے نہ آنے سے مجھے تشویش رہتی ہے۔ میری تشویش تم کو کیوں پسند ہے!

محررۂ یکشنبہ ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء غالبؔ

(۷۰)

یکشنبہ۔ سوم ذی القعدہ ۱۲۷۵ھ و پنجم جون سالِ حال (۱۸۵۹ء)

صاحب۔

آج تمہارا خط صبح کو آیا۔ میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔ تمہاری ناسازیِ طبع سن کر دل کڑھا۔ حق تعالیٰ تم کو زندہ و تندرست اور خوش رکھے۔ اوراقِ مثنوی بھیجے ہوئے، بہت دن ہوئے، جس میں حکایت طالب علم اور رمنار کی تھی، واقعہ بلند شہر کا اور وہ اوراق میں نے بیم نلٹ پاکٹ نہیں بھیجے۔ خط میں لپیٹ کر، چونکہ خط ڈبل تھا۔ دو ٹکٹ لگا کر ارسال کیے ہیں۔ رسید ملے، تو اس کو دیکھ کر تاریخ معلوم ہو جائے۔ قیاس سے ایسا جانتا ہوں کہ پانچ سات دن ہوئے ہوں گے۔ منشی نبی بخش کا خط بہت دن سے نہیں آیا۔ گھر ان کا "تاج گنج" ؛ وہ خود مع بعضِ متعلقین آگرے۔ ایک بار تاج گنج کے پتے سے خط ان کو بھیجا تھا، جواب نہ آیا۔ اب ناچار برخوردار منشی شیو نرائن سے ان کا حال پوچھونگا۔ تم باہمہ کمالات خفقانی بھی ہو۔ رائے امید سنگھ سے خط کی امید کیوں رکھتے ہو؟ جب آگرے جاؤ گے اور وہاں ہونگے تو ملاقات ہو جائیگی۔ میں خود واقف نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ازروے قیاس کہ سکتا ہوں کہ آگرے۔ بایندہمہ کبھی کہیں سے ان کا کوئی خط مجھ کو آیا ہو، تو میں گنہگار۔

غالبؔ

(۷۱)

صاحب!

ہم تمھارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے۔ میں ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے۔ تمھارا حال سن کر مجھ کو رنج ہوا۔ کیا کروں! نہ اپنے رنج کا چارہ کر سکتا ہوں، نہ اپنے عزیزوں کی خبر لے سکتا ہوں۔ خیر،

ہر آنچہ ساقیِ ما ریخت، عینِ الطاف است

آج چوتھا دن ہے یعنی منگل کے دن کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ راجہ امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔ پوچھا گیا کہ کہاں سے آئے ہو؟ فرمایا کہ آگرے سے آتا ہوں۔ ’بساون کی گلی جو حکیموں کی گلی کے قریب ہے‘ جورس صاحب کی کوٹھی انھوں نے مول لی ہے اور اس کے قریب کی زمینِ افتادہ بھی خریدی ہے اور اس کو بنوا رہے ہیں۔ تمھارا میں نے ذکر کیا کہ ہر خط میں تم کو پوچھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میں نے کئی خط بھیجے جواب نہیں آیا۔ بولے کہ ایک خط ان کا آیا تھا، اس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ پھر ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ بہرحال میرے پھوڑے نکل رہے ہیں۔ میں باز دید کو نہیں گیا۔ شاید وہ آج گئے ہوں، یا جاویں۔ پھر اکبر آباد کو جائینگے۔ میں آج آدمی ان کے پاس بھیجونگا۔

کل مرزا حاتم علی مہرؔ کا خط آیا تھا۔ تم کو بہت پوچھتے تھے کہ آیا مرزا تفتہؔ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ بھائی ان کو خط لکھ بھیجو۔

محررۂ ۱۷ ؍ جون ۱۸۵۹ء

(۷۲)

صاحب!

ایک خط تمھارا پرسوں آیا۔ اس میں مندرج تھا کہ میں میرٹھ جاؤنگا۔ آج صبح کو ایک خط تمھارا اور آیا۔ اس میں مندرج کہ پہلی جولائی کو جاؤنگا۔ اور تجھ

ملتا جاؤں گا۔ پرسوں کے خط میں بھی اور آج کے خط میں بھی پارسل کا ذکر تھا کہ ۲۰ جون کو ہم نے بھیجا ہے۔ بیسویں جون کو آج دسواں دن ہے۔ اس دس دن میں کوئی پارسل، کوئی بم فلٹ پاکٹ میرے پاس نہیں پہنچا۔ آخری بم فلٹ پاکٹ دو مثنویوں کا وہ تھا کہ جس میں ایک مثنوی بلند شہر کے واقع کی تھی کہ ایک لڑکا مرگیا، اس کی ارتھی بھکتی رہی، اس کا عاشق سامنے کھڑا جلتا رہا۔ سو ان دونوں مثنویوں کو میں نے اصلاح دے کر تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔ بلکہ یوں یاد پڑتا ہے کہ تم نے اس کی رسید بھی لکھ بھیجی ہے۔ لیکن مجھ کو گمان یہ ہے کہ یہ امر ۲۰ جون سے آگے کا ہے۔ بہر تقدیر بعد اس پارسل کے کوئی اور پارسل میرے پاس نہیں آیا۔ اصلاحی کاغذ ہر طرف کے عموماً اور تمہارے خصوصاً دو دن سے زیادہ میں نہیں رکھتا۔ جو کاغذ مجھ تک نہ پہنچے، میں ناچار ہوں بلکہ خود میرے ایک خط کا جواب تم پر قرض ہے۔ یا تو وہ نہ پہنچا، یا تم نے اس کا جواب لکھنا ضرور نہ جانا۔ وہ خط جس میں میر بادشاہ کا دلی آنا اور ان کا مجھ سے ملنا اور تمہارا ذکر مجھ میں اور ——— ان میں ہونا، معہذا راجہ امید سنگھ کا دلی میں آنا اور بے خبر میرے گھر آجانا اور تمہارا ان سے ذکر ہونا اور ان کا یہ کہنا کہ ان کا کل ایک خط میرے پاس آیا تھا۔ سو میں نے اس کا جواب لکھ بھیجا تھا۔ اب میں کیا جانوں کہ تم کو یہ خط پہنچا، یا نہیں پہنچا۔ تمہارا وہ پارسل جس کو تم اب مانگتے ہو، میرے پاس ہرگز نہیں آیا۔

چہارشنبہ ۲۹ جون ۱۸۵۹ء وقت نیم روز   غالب

(۷۳)

میاں۔

تمہارے انتقالات ذہنی نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمہارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدردان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ

تھوڑی سی راحت درکار ہے اور ریاضی حکمت اور سلطنت اور شاعری
اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا!
اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا! دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیئے تو
کیا! کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یارِ جانی!
ہرچند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اس پایے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ
پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہِ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر
جاؤں! عالمِ بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں، وہاں تمام
عالم، بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں پر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے
جاتا ہوں، اور جس سے جو معاملہ ہے اسکو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب
کو وہم جانتا ہوں یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے
ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور
رہینگے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا۔ قطعات تاریخ آگرے
کیوں کر بھیجوں، پھر تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔

'خالقِ معنی' بہ معنی "معنی آفریں" صحیح اور مسلّم اور جائز۔ لیکن جس
طرح 'اللہ' میں مشدّد لام، کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے "الٰہ"
'الٰہی' میں الفِ ممدودہ کو دوسرا الف کیونکر سمجھیں! قیاس کا کام نہیں آتا،
اتفاقِ سلف شرط ہے 'الٰہی' میں جب اور کسی نے دو الف نہیں مانے، تو ہم
کیونکر مانیں؟

"دویم" بروزن 'جویم' غلط۔ 'دوم' ہے بغیر تحتانی۔ بالفرض تحتانی
بھی لکھیں، تو 'دوم' پڑھینگے، اگرچہ لکھیں گے دویم واو کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں
"دوی" درست ہے مگر نہ بہ حذفِ تحتانی مثل 'زمی' بہ حذفِ نون بلکہ بہ
طریقِ قلب بعض "دویم" کا 'دوی' ہو گیا۔ کنوئے کی تاریخ کو بے تامل بھیج
دو اور تاریخِ وفات کا اور مادہ سوچو کس واسطے کہ جب 'الٰہی' میں سے

ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائیگا۔ والدعا۔
روز ورود دِنامہ بلکہ وقت ورودِ نامہ۔ بعد خواندان نوشتہ شد۔ یک شنبہ
از غالبؔ

(۷۴)

بھائی۔
تمھارے ذہن نے خوب انتقال کیا۔ میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا ؎
یہ ہند آمدندے از ایراں دیار
"آمدند" کی جگہ "آمدندے" بہ صیغۂ استمرار ٹکسال باہر معلوم ہوا۔
رسیدند در ہند ز ایراں دیار
اس کی جگہ لکھ دیا۔ واقعی پوستین کا پہنچنا راہ میں واقع ہوا۔ پھر "رسیدند در ہند" بیجا، تمھارا تصرف مستحسن۔ جس طرح تم نے لکھا ہے اسی طرح رہنے دو۔
صاحب۔ "سنبلستان" سے کیوں گھبراتے ہو؟ میں تمھارے گھبرانے سے گھبراتا ہوں۔ 'رخ' کو 'گل'، 'زلف' کو 'سنبل' فرض کرتے ہیں۔ 'سنبلستان' میں کیا عیب ہے؟ اور اگر نہیں پسند تو یہ قصہ ہی جانے دو۔ اس وقت تک کہ اکتوبر کی آٹھویں، ہفتہ کا دن، تیسرے پہر کا وقت ہے، میر قاسم علی صاحب تشریف نہیں لائے۔ ہاترس کے منصف اور دلّی کے نامنصف ہیں۔
روز شنبہ۔ ہشتم اکتوبر ۱۸۵۹ء۔ آخر روز
از غالبؔ

(۷۵)

صاحب۔
تمھارا خط آیا۔ حال معلوم ہوا۔
جہانیان ز تو برگشتہ اند اگر غالبؔ
ترا چہ باک؟ خدائے کہ داشتی داری

خدا کے واسطے! میرے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے؟ بہ نسبت
حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے، وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الٰہی بخش
جو شاہزادوں میں ہیں ان کو حکم "کراچی بندر" جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے
ہیں۔ دیکھئے کیا ہو! حکیم جی کو ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل
ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں

تو بیکسی و غریبی، ترا کہ می پرسد!

نہ جزا، نہ سزا، نہ نفریں، نہ آفریں، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر۔ ۱۵ دن
پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔
شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر نہیں ہے۔ مگر تم کو
میرے سر کی قسم یہ لکھ بھیجو کہ میری خبر تم نے کیا سنی۔ مجھے اس کے معلوم ہونے
سے مزا ملیگا۔

شنبہ ۵، نومبر ۱۸۵۹ء غالبؔ

(۷۶)

میری جان۔
کیا سمجھے ہو؟ سب مخلوقات تفتہ و غالب کیوں کر بن جائیں۔

ہر یکے را بہر کارے ساختند

انت متا، سوم متا، مصری میٹھی، نمک سلونا، کبھی کسی شے کا مزا نہ بدلیگا۔ اب
جو میں اس شخص کو نصیحت کروں، وہ کیا نہ سمجھیگا کہ غالب کہا جانے کہ عبدالرحمٰن
کون ہے اور مجھ سے اس سے کیا رسم و راہ ہے۔ بے شبہ جانیگا کہ تفتہ نے
لکھا ہوگا۔ میں اس کی نظر میں سبک ہو جاؤنگا اور تم سے وہ اور بھی
سرگراں ہو جائیگا۔ اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ تو نے اس شخص کو اپنے عزیزوں
میں گنا ہے۔ بندہ پرور، میں تو بنی آدم کو، مسلمان یا ہندو یا نصرانی، عزیز
رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی

وہ عزیز داری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں، اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے۔ اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھ کو اس شخص سے خس برابر علاقہ عزیز داری کا نہیں۔ از راہِ حسن اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے؟ زین العابدین خاں، عارف میری سالی کا بیٹا، یہ شخص اس کی سالی کا بیٹا، اس کو جو چاہو، سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ جب ادھر سے آدمیت نہ ہوئی تو اب اس کا لکھنا لغو و بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔ تمہارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفیٰ خاں سے ملنا ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اب تمہارے خط سے مراد آباد ہو کر سکندر آباد آنا معلوم ہو گیا۔ حق تعالیٰ شانہ، تم کو خوش و خرم رکھے۔

مرقومہ جمعہ۔ ۲۳، دسمبر ۱۸۵۹ء

(۷۷)

بھائی!

میں نے دلّی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔ پنج شنبہ ۱۹ کو مراد نگر اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہنچا۔ آج پنج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ بھیجا۔ کل شاہجہانپور، پرسوں گڑھ مکتیسر ہوں گا پھر مراد آباد ہوتا ہوا رامپور جاؤں گا۔ اب جو مجھ کو خط بھیجو، رام پور بھیجنا سرنامے پر رام پور کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ اب اسی قدر لکھنا کافی تھا۔ باقی جو کچھ لکھنا ہے وہ رام پور سے لکھوں گا۔

مرقومہ چاشت گاہ شنبہ۔ ۲۱، جنوری ۱۸۶۰ء

راقم غالبؔ

(۷۸)

صاحب۔

تمہارے یہ اوراق سکندر آباد سے دلّی اور دلّی سے رامپور پہنچے

یقین ہے کہ رامپور سے میرے بھیجے ہوئے سکندر آباد پہنچے ہونگے سوائے ایک مصرع کے مجھے اور جگہ کی اصلاح یاد نہیں۔ تم جو اپنے فرزند کو ناشناسئے مزاج روزگار کہتے ہو، خود اس میں اُس سے کیا کم ہو! پہلے تو یہ بتاؤ کہ رامپور میں مجھے کون نہیں جانتا۔ کہاں مولوی وجیہ الزماں صاحب، کہاں میں! ان کا مسکن میرے مسکن سے دور۔ پھر در دولت رئیس کہاں اور میں کہاں! چار دن والیٔ شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اس میں رہتا ہوں۔ بہ حسبِ اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام۔ محلّے کی اور عرف کی حاجت نہیں۔ بلکہ در دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے۔ دوسری بات جو تم نے لکھی ہے، وہ بھی مطابقِ واقع و مناسبِ حال نہیں۔ اگر اقامت قرار پائی، تم کو بلا لونگا۔

[۱۸۶۰ء] غالب

(۷۹)

میری جان۔

آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ بہ شرط اقامت بلا لونگا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری، تو بے تمھارے نہ رہونگا، نہ رہونگا، نہ رہونگا۔ منشی بال مکند بیصبر کا خط بلند شہر سے دلّی اور دلّی سے رامپور پہنچا تلف نہیں ہوا۔ اگر میں یہاں رہ گیا، تو یہاں سے؛ اور اگر دلّی چلا گیا؛ تو وہاں سے اصلاح دے کر ان کے اشعار بھیج دونگا۔ بیصبر کو اب کی بار مہینا بھر صبر چاہیئے۔ وہ لفافہ بدستور رکھا ہوا ہے۔ از بسکہ یہاں کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں، فرصتِ مشاہدۂ اوراق نہیں ملی۔ تم

اسی رقعے کو ان کے پاس بھیج دینا۔

سہ شنبہ۔ ۱۴۔ فروری ۱۸۶۰ء غالبؔ

(۸۰)

[illegible] ردار سعادت آثار منشی ہرگوپال سلمہ اللہ تعالیٰ۔

اس سے آگے تم کو حالات مجمل لکھ چکا ہوں۔ ہنوز کوئی رنگ قرار کا نہیں پایا۔ بالفعل نواب لفٹننٹ گورنر بہادر مرادآباد اور وہاں سے رامپور آئینگے۔ بعد ان کے جانے کے کوئی طور اقامت یا عدم اقامت کا ٹھہریگا۔ منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا، تو فوراً تم کو بلا لونگا۔ جو دن زندگی کے باقی ہیں۔ وہ باہم بسر ہو جائیں۔

یکم مارچ ۱۸۶۰ء والدعا
راقم غالبؔ

(۸۱)

مرزا تفتہ!

اس عمر دگی میں مجھ کو ہنسانا تمھارا ہی کام ہے۔ بھائی تضمین گلستاں چھپوا کر کیا فائدہ اٹھایا ہے، جو انطباع "سنبلستان" سے نفع اٹھاؤ گے؟ روپیہ جمع رہنے دو۔ آمد اچھی چیز ہے، اگرچہ قلیل ہو۔ اور اگر روپیہ لینا منظور ہے تو ہرگز اندیشہ نہ کرو اور درخواست دے دو۔ بعد نو مہینے کے روپیہ تم کو مل جائے گا۔ یہ میرا ذمہ کہ اس نو مہینے میں کوئی انقلاب واقع نہ ہو گا۔ اگر احیاناً ہوا بھی تو ہوتے ہوتے اس کو مدت چاہیئے۔ "رستخیز بیجا" ہو چکا۔ اب ہو تو "رستخیز" ہو یعنی قیامت اور اس کا حال معلوم نہیں کہ کب ہو گی۔ اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی "رستخیز" کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں۔ احتمالِ فتنہ سالِ آئندہ پر رہا، سو بھی موہوم۔

میاں، میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں یہاں آ گیا

ہوں۔ تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا
قول ہے کہ یہ شخص والیِ رامپور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا اگر نواب نے کچھ
سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار روپیے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے
کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ
لیا تھا، دو سو روپیہ مہینا کر دیا تھا۔ لفٹننٹ گورنر الٰہ آباد جو رامپور آئے
اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے
کہا کہ اگر ہماری خشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب نے برطرف
کر دیا۔ یہ سب تو سُن لیا۔ اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر
تیس بتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔
آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا ماہ
بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا، دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ یہ شرطِ
حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینا، یہاں رہوں، وہاں
رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء غالب

(۸۲)

مرزا تفتہ۔

ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجبِ
نشاطِ مفرط ہوگا۔ میں اجرائے پنسن سرکار انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے
وہ نقشہ پنسن داروں کا جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم
نے بہ نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنسن پانے کا مستحق نہیں ہے، گورنمنٹ
نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میرے پنسن کے اجرا کا حکم دیا اور
وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا۔ میں نے بھی سنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آئندہ
یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیئے، پچھلے روپے کے

باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۶؍اپریل ۱۸۶۰ء غالب

(۸۳)

شنبہ ہشتم مئی ۱۸۶۰ء ۔ ہنگام نیمروز ۔

بھائی ۔

آج اس وقت تمھارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔ زرِ سالہٗ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوئے۔ سات سو پچاس روپیہ سال پاتا ہوں تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مد دخرچ ملے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار روپئے۔ میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرضدارِ قدیم ہوں۔ اب جو وہ دو ہزار لایا اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجئے۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کروایا۔ گیارہ سو کئی روپیے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے اصل میں۔ یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دیدو۔ پانسو سات روپیے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے، نوسو باقی رہے۔ آدھے تو لے، آدھے مجھ کو دے۔ پرسوں چوتھی کو وہ روپیہ لایا ہے۔ کل تک قصہ نہیں چکا۔ میں جلدی نہیں کرتا، دو ایک مہاجن بیچ میں ہیں۔ ہفتے بھر میں جھگڑا فیصل ہو جائیگا۔ خدا کرے یہ خط تم کو پہنچ جائے۔ جس دن برات سے پھر کر آؤ اسی دن اپنے ورودِ مسعود کی خبر دینا

والدعا۔ غالب

(۸۴)

برخوردار مرزا تفتہ۔

دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا۔ تم سچے اور میں معذور۔ اب میری کہانی

ستو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنشن داران قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار بہ طریق ششماہہ فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا۔ تار امپور کی آمد مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح کٹواں دینا پڑے گا؛ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائیگی۔ ؎

رسم ہے مُردے کی چھماہی ایک　　خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بہ قیدِ حیات　　اور چھماہی ہو سال میں دو بار

دس گیارہ برس سے اس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپیہ دیا کیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیے یک مشت دیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو میں اٹھوں۔ بید ردیں مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول، اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سونا۔ گرمی کی شدت، پاڑ کا قرب۔ گمان یہ گذرتا تھا کہ کٹ گھرا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گذریں۔ دو شنبہ ۹ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہات آگیا۔ وہاں جا رہا۔ جی ان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے بہشت ہے اور یہ خوبی کہ محلہ وہی "بلی ماروں" کا۔ اگرچہ ہے یوں کہ میں اگر اور محلے میں بھی جا رہتا تو قاصدان ڈاک وہیں پہنچتے۔ یعنی اب اکثر خطوط لال کنوے کے پتے سے آتے ہیں اور بے تکلف یہیں پہنچتے ہیں۔ بہر حال تم وہی دلی، بلی ماروں کا محلہ لکھ کر خط بھیجا کرو۔ دو مسودے تمھارے اور ایک مسودہ بیجر کا یہ تین کاغذ در پیش ہیں۔ دو ایک دن میں بعدِ اصلاح ارسال کیے جائینگے۔ خاطر خاطر جمع رہے۔

صبح جمعہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء

صبح دوشنبہ۔ پنجم جمادی الاول ۱۲۷۷ھ و نوزدہم نومبر سال حال (۱۸۶۰ء)

میرزا تفتہ!

کل تمہارا خط مع کاغذ اشعار آیا۔ آج تم کو یہ خط لکھتا ہوں اور اسی خط کے ساتھ خط موسومۂ میر بادشاہ بھیجتا ہوں۔ کاغذ اشعار کل یا پرسوں روانا ہوگا۔ فنِ تاریخ کو دون مرتبۂ شاعری جانتا ہوں اور تمہاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حقِ محبت ہوتا ہے۔ بہر حال میں نے منشی نبی بخش مرحوم کی تاریخِ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا منشی قمر الدین خان صاحب نے یہ ناپسند کیا۔ قطعہ یہ ہے ؎

شیخ نبی بخش کہ با حسنِ خلق ۔۔۔ داشت مذاقِ سخن و فہمِ تیز

مرگِ ستم پیشہ امانش نداد ۔۔۔ کیست کہ با مرگ بسیجد ستیز

سالِ وفاتش زپے یادگار ۔۔۔ با دلِ زار و مژہ دجلہ ریز

خواستم از غالبِ آشفتہ سر ۔۔۔ گفت مدہ طول، دگو "رستخیز"

۱۲۷۷

ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ جامعِ اعداد نکال لیا کرتے ہیں بلکہ قیدِ معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے۔ جیسا کہ یہ مصرع ؎

دو سالِ عرس ہر آنکہ ماند بیند

انوری کے قصائد کو دیکھو۔ دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدے کے آغاز میں لکھے ہیں جس میں اعدادِ سالِ مطلوب نکل آتے ہیں؛ اور معنی کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ "رستخیز" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر واقع کے مناسب! اگر تاریخِ ولادت یا تاریخ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہہ نامستحسن تھا۔ قصہ مختصر۔ اگر تاریخ کی فکر موجبِ ادائے حقِ مودت ہے، تو میں حقِ دوستی ادا کر چکا۔ زیادہ کیا لکھوں!

داد کا طالب غالبؔ

(۸۶)

صاحب۔

تمہارا خط میرٹھ سے آیا۔ 'مراۃ الصحائف'، کا تماشا دیکھا۔ "سنبلستان" کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے اور خدا ہی تمہاری آبرو کا نگہبان رہے۔ بہت گذر گئی ہے تھوڑی رہی۔ اچھی گذری ہے۔ اچھی گذر جائیگی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے عرفی کو کیا ہات آیا، جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا! سعدی کا نے 'بوستاں'، سے کیا پھل پایا جو تم 'سنبلستاں'، سے پاؤ گے! اللہ کے سوا جو کچھ ہے، موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے نہ سخنور ہے، نہ قصیدہ ہے، نہ قصد ہے۔ لا موجود الا اللہ۔

جناب بھائی صاحب یعنی نواب مصطفیٰ خاں بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہ دینا۔ ہمشیرہ کے پنسن کا جاری ہو جانا بہت خوشی کی بات ہے مگر خوشی سے تعجب زیادہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس سے بھی زیادہ خوشی اور زیادہ تعجب کی بات بر روئے کار آوے یعنی آپ کا پنسن بھی واگذاشت ہو جاوے۔ اللہ، اللہ، اللہ!

صبح یک شنبہ۔ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء

(۸۷)

اجی مرزا تفتہ!

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائچے لیرلیر، جوتی ٹوٹی، یہ مبالغہ نہیں۔ بلکہ بے تکلف "سنبلستان"، ایک معشوقِ خوب رو ہے، بدلباس ہے۔ بہرحال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دے دیں اور معلم کو حکم دیا کہ اسی کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہوگیا۔

مرقومہ صبح سہ شنبہ ۹ اپریل ۱۸۶۱ء غالب

میاں مرزا تفتہ۔

ہزار آفریں۔ کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ، چشمِ بد دور! تسلسلِ معنی، سلاستِ الفاظ! ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محلِ فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا۔ وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے:

چاک گر دیدم وا ز جیب بہ داماں رفتم

پہلا مصرع تمہارا اگر اس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔ خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان بیس جزو قصائد کا کہ لو۔ مگر خبردار، قصائد بہ قید تروت بھیجی نہ جمع کرنا!

صاحب! "مجھے اس بزرگوار کا معاملہ" اور یہ جو تم نے اس کا وطن اور پیشہ اب لکھا ہے۔ سابق کا تمہارا لکھا ہوا، سب یاد ہے۔ میں نے اس کو 'دوست' بہ طریقِ طنز لکھا ہے۔ بہرحال وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اس کو بھیجا، اس کی ماں مرے، اگر میرے اس خط کا جواب لکھا ہو۔ بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا۔ داغِ کہنہ حسرت کو چمکایا۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گذرا اور جس دن گذرا اسی دن پانچ ہزار روپے کے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے۔ انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے 'میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا'۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گذری۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ پانچ ہزار ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا اگر نہ بھیجا ہو، تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے

اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو۔ اس کا مضمون یہ ہو کہ میں
نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ
حضور میں گذرا، مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں
کہ ناسخ ہوں۔ اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر، ان کا کھایا ہوا روپیہ ان
کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دونگا۔ بھائی، یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں
روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا، تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر
مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں، اور ناسخ کیا کرے۔

دوشنبہ۔ ۱۹ر اگست ۱۸۶۱ء　　　　　غالب

(۸۹)

میرزا تفتہ صاحب۔

اس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔
پہلے تو یہ کہ 'خنجر را' 'گوہر را' کو تم نے از قسم تنافر سمجھا اور اس پر اشعار
اساتذہ سند لائے۔ یہ خدشہ نہیں پیدا ہوتا، مگر لڑکوں کے اور مبتدیوں
کے دل میں۔ سلیم ے

شراب نقل نخواہد بگیر ساغر را　　　کہ احتیاج شکر نیست شیر مادر را

یہ غزل شاہجہاں کے عہد کی طرحی ہے۔ صائب و قدسی و شعرائے ہند نے اس پر
غزلیں لکھی ہیں۔

دوسرے یہ کہ ممدوح کا پورا نام بے تکلف آتے ہوئے خالی کیوں اٹھا
دو؟ ضیاء الدین احمد خان نام ہے۔ ہندی میں رخشاں تخلص، فارسی
میں نیر تخلص۔ ع

ہمانا نیر رخشاں ضیاء الدین احمد خاں

دیکھو تو کیا پاکیزہ مصرع ہے۔ یہ نہ کہنا کہ شعر، ممدوح کا نام ننگا لکھ جاتے
ہیں۔ وہ بحسب ضرورت شعر ہے۔ جس بحر میں پورا نام نہ آئے اس میں

شوق سے لکھو۔ جائز، روا مستحسن جس بحر میں نام ممدوح کا درست آئے
اس میں فروگذاشت کیوں کرو؟
دوشنبہ۔ نہم ستمبر ۱۸۶۱ء

(۹۰)

صاحب۔
قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا۔ آفرین! پھر استاد کے شعر کیوں
تضمین کرتے ہو؟ نہ اس کی کچھ حاجت، نہ اس میں کوئی افزائشِ حسن۔
تمہارے ایک شعر کو ایک شعر کے بعد رکھ دیا ہے تاکہ منقطع کلام ہو جائے۔
قصیدہ تمہارا "برآورم"، "درآورم" کی ردیف کا سست ہے۔
اس کو ہم نے نامنظور کیا۔ مگر نظرِ ثانی میں جو شعر قابل رکھنے کے ہونگے۔ وہ
لکھ کر تم کو بھیج دینگے۔ بالفعل ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں تاکہ
آیندہ اس بالغز سے احتراز کرو۔

نورِ سعادت از جبہۂ قاصدم چکد

یہ کیا ترکیب ہے؟ 'جبہہ' بروزن چشمہ ہے۔ یعنی دو ہائے ہوز ہیں۔
"جبہۂ قاصد" ایک ہائے ہوز کہاں گئی؟

ہر کجا چشمۂ بود شیریں

'چشمۂ' کی جگہ 'چشمہ' لکھتے ہو یہ بات ہمیشہ یاد رہے۔ تم نے بڑے مشاق
سے ایسی غلطی بہت تعجب کی بات ہے۔

میاں،

برگِ دنیا نہ سازِ دنیش بود

یہ کوئی لغت نہیں، ایک لفظ نہیں، کہ کسی فرہنگ میں نکل آئے۔ یہ طرزِ تحریر
ہے۔ کس کو یاد ہے کہ اس کا نظیر کہاں موجود ہے۔ اس امر سے قطع نظر وہ شخص ایسا
کہاں کا فارسی داں اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بحثی کروں۔ دد

جوتیاں آپ لگا دیں۔ ایک جوتی تم سے لگوا دی۔ اب قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ۔

میں "برہان" کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ "چار شربت" اور "غیاث اللغات" کو حیض کا لتا سمجھتا ہوں۔ ایسے گم نام چھوکروں سے کیا مقابلہ کرونگا! "برہان قاطع" کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے، اس کا نام "قاطع برہان" رکھا ہے۔ اب اس کے چھاپے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو گیا، تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دونگا۔ ورنہ کاتب سے نقل کروا کر قلمی ایک جلد بھیج دونگا۔ بہت سود مند نسخہ ہے۔

اس قصیدۂ متبرکہ موافق اصلاح کے اس کاغذ سے اور کاغذ پر نقل کر کے اور جو مطالب کہ اس کاغذ پر مرقوم ہیں، ان کو حافظے کے سپرد کر کے اس ورق کو پھاڑ ڈالو اور اس قصیدہ پر ناز کیا کرو۔ یہ قصیدہ تمہارا ہم کو بہت پسند آیا ہے۔

جمعہ۔ ۴، اکتوبر ۱۸۶۱ء غالبؔ

(۹۱)

صاحب۔

یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، اس کا تمہیں صلہ دے۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں سے قصیدے کی رسید آگئی۔ یقین ہے کہ تم کو بھی وہ خط لکھیں۔ در ایں ولا یہاں آنا چاہتے ہیں اور مجھ کو یہ لکھا تھا کہ قصیدہ پہنچا۔ کیا کہنا ہے! ایسا ہے اور ایسا ہے۔ میں چند روز میں وہاں آتا ہوں۔ عند الملاقات اس قصیدے کے باب میں باتیں ہونگی۔

ضیاء الدین احمد خاں صاحب کا بھی مقدمہ آج کل میں فیصل ہوا چاہتا ہے۔ وہ قصیدہ جو میرے پاس امانت ہے، ان کو دیا جائیگا۔ انشاء اللہ العلی العظیم۔

از من فراغ برد، بر یدم من از فراغ

"بریدم من از فراغ" یعنی "قطع نظر کردم از فراغ و نومید شدم از فراغ"۔

(۹۲)

تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمہارے یہاں آئے۔ ان کو میں نے تمہاری فکر اور تلاش کا مداح پایا۔ جنوری ۱۸۶۲ء کچھ تمہاری خدمت میں بھیجیں گے۔ تم کو قبول کرنا ہوگا۔ سمجھے، یہ کون؟ یعنی نواب مصطفیٰ خاں صاحب اور دوسرے ممدوح یعنی نواب ضیاء الدین خان، وہ آخر دسمبر ۱۸۶۱ء میں یا اوائل جنوری ۱۸۶۲ء میں حاضر ہونگے۔

(۹۳)

بھائی۔

"ریمیا" اور "ہیمیا" خرافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاطون اور بو علی یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ 'کیمیا' اور 'سیمیا' دو علم شریف ہیں؛ جو اشیا کی تاثیر سے تعلق رکھے وہ 'کیمیا'، اور جو اسماء سے متعلق ہو وہ 'سیمیا'۔

جان غم سیمیا نخورد گئے   دل سوے کیمیا نیاورد دم

شعر بامعنی ہو گیا۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟

زمان و زمانہ کو میں پاگل ہوں جو غلط کہونگا۔ ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں زمان و زمانہ لکھا ہوگا۔

وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا؟ سمجھو، پہلا مصرع لغو، دوسرے مصرع میں "نبرد" کا فاعل معدوم۔ 'حلقہ زا' کی 'زے' پر نقطہ نہ تھا۔ میں نے غصہ میں لکھا کہ نہ "حلقہ را" درست نہ "حلقہ زا" درست۔ مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے۔ خیر دنہ دو، مرتا ہوں۔ مجھے سمجھاتے ہو کہ "صد جا در کلام اہل زبان خواہند یافت" مگر بیں یا تیں کلام اہل زبان نہیں۔

گردش چرخ استخوان سائید

اس سے یہ بہتر ہے ۔ ؏

سودہ شد استخواں ز گردش چرخ

باقی اور مصرعے سب اچھے بنائے ہیں

غالبؔ

(۹۴)

صاحب ۔

دو زبانوں سے مرکب ہے یہ فارسی متعارف : ایک فارسی، ایک عربی، ہر چند اس منطق میں لغات ترکی بھی آجاتے ہیں ۔ مگر کمتر ۔ میں عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ۔ علما سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طالب رہتا ہوں ۔ فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر ۔ اہل پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان ۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے ۔ سو، دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں ''جود'' لغت عربی ہے بہ معنی بخشش ۔ ''جواد'' صیغہ ہے صفت مشبہ کا بے تشدید اس وزن پر صیغہ فاعل میری سماعت میں جو نہیں آیا تو میں اس کو خود نہ لکھونگا ۔ مگر جب کہ نظیری شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم تھا، تو میں نے مانا ۔

کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا اور اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں ۔ لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں ۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں

غزل، قصیدہ لکھنے لگا۔ تم کہتے ہو نظیری کا دیوان وقت تحریر قصیدہ پیش نظر ہوگا اور جو اس کے قافیے کا شعر دیکھا ہوگا۔ اس پر لکھا ہوگا۔ واللہ اگر تمہارے اس خط کے دیکھنے سے پہلے میں یہ جانتا ہوں کہ اس زمین میں نظیری کا قصیدہ بھی ہے۔ چہ جائے آں کہ وہ شعر بھائی، شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

'زمان' لفظ عربی 'ازمنہ' جمع۔ دونوں طرح فارسی میں مستعمل۔ "زمانے"، "یک زمان"، 'ہر زمان'، 'دریں زماں'، 'درآں زماں'، سب صحیح اور فصیح۔ جو اس کو غلط کہے، وہ گدھا۔ بلکہ اہلِ فارس نے مثل 'موج'، و 'موجہ'، یہاں بھی "ہے" "بڑھا کر" زمانہ "استعمال کیا ہے "یک زمان"، کو میں نے کبھی غلط نہ کہا ہوگا۔ سعدی کے شعر لکھنے کی کیا حاجت؟

سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیٔ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں۔ وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھا گھس الو عبدالواسع ہانسوی لفظ 'نامراد' کو غلط کہتا ہے۔ اور یہ الو کا پٹھا قتیل صفوتکدہ شفقتکدہ و دانشترکدہ، کو اور 'ہمہ عالم'، و 'ہمہ جا'، کو غلط کہتا ہے کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو 'یک زماں'، کو غلط کہونگا؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہات میں ہے۔ للہ الحمد وللہ الشکر۔

مرقومۂ چہارشنبہ۔ ۲۷ ماہ اگست ۱۸۶۲ء

(۹۵)

میرزا تفتہ۔

جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذاللہ۔ تم سے اور آزردگی! مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوستِ صادق الولاء رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ موجبِ ملال ہو! رہا غمّاز کا کہنا۔ اس کا حال یہ ہے کہ

میرا حقیقی بھائی کُل ایک تھا۔ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری برائی کہتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔

بھائی، مجھ میں کچھ اب باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گذر گئی، لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہو گئی۔ خاطر میری جمع ہے کہ اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں۔ یہ کار آمدنی نہیں۔ خیر کبھی دیکھ لونگا، جلدی کیا ہے۔ تین بات جمع ہوئیں: میری کاہلی، تمھارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہوتا۔ نظر ان مراتب پر، کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بال مکند بیصبر کا ایک پارسل ہے کہ اس کو بہت دن ہوئے آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس، پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا۔ آج اس وقت، کہ سورج بلند نہیں ہوا، اس کو دیکھا لفافہ کیا۔ آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوایا۔

غالب

۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء

(۹۶)

میرزا تفتہ کہ پیوستہ بدل جا دارد
ہر کجا ہست خدایا بسلامت دارش

صاحب۔

کئی بار جی چاہا کہ تم کو خط لکھوں مگر متحیر کہ کہاں بھیجوں۔ اب جو تمھارا خط آیا معلوم ہوا کہ حضرت ابھی لکھنؤ میں رونق افروز ہیں۔ خط نہ بھیجوں تو گنہگار۔ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مجھ میں اصلاح کی مشقت کی طاقت نہیں رہی۔ معہذا

تمہارا کلام پختگی کو پہنچ گیا ہے، اصلاح طلب نہیں رہا ہے۔ شیر ایک مدت تک اپنے بچے کو آئین شکار سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتا ہے، تو خود بے اعانت شیر شکار کیا کرتا ہے۔ یہ میں نے نہیں کہا کہ تم مجھے اپنے کلام دیکھنے سے محروم رکھو جو غزل، قصیدہ لکھا کرو، نہ مسودہ بلکہ ایک نقل اس کی ضرور مجھ کو بھیجا کرو۔

(۹۷)

صاحب بندہ،

میں نے بکس کا ایک ایک خانہ دیکھا۔ سوائے تین کاغذوں کے کوئی کاغذ تمہارا نہ نکلا۔ اور اس وقت بہ سبب کم فرصتی کے میں ردیف ان تینوں قصیدوں کی نہیں بنا سکتا اور وہ مقدمہ "۵۰" کا بہ اقتضائے حالات زمانہ سست ہو گیا ہے، مٹ نہیں گیا۔ دیر آید درست آید۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اب میرا حال سنو:

در نومیدی بسے امید است   پایان شب سیہ سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار و خلعت بند کر گئے میں ناامید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس رہا۔ اب جو یہاں لفٹننٹ گورنر پنجاب آئے ہیں، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملینگے۔ کل انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کرینگے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ دارون اور مالگذاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائینگے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا۔ تم بھی انبالے جاؤ۔ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی، کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گذری۔ گویا مردہ جی اٹھا۔ مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سنا گذرا کہ سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں! اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے ادھر قصیدے کی فکر

اُدھر روپے کی تدبیر۔ جو اس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے۔ وہ روپیہ کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کریگا۔ لیکن ان دنوں میں نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے یہ کئی سطریں تمہیں اور ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب صاحب کو لکھ کر بھیج دی ہیں۔ جیتا رہا، تو انبالے سے آکر خط لکھونگا۔

روز چارشنبہ ۱۳ رمضان [۱۲۷۹ھ] ۴ مارچ ۱۸۶۳ء

(۹۸)

لو صاحب، ہم نے لفٹننٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کرکے انبالے کا جانا موقوف کیا۔ بڑے گورنر کا دربار اور خلعت، اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہات پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے دیکھیے انجامِ کار کیا ہوتا ہے۔

[۱۸۶۳ء] غالبؔ

(۹۹)

حضرت۔

پرسوں صبح کو تمھارے سب کواغذ ایک لفافے میں بند کرکے ڈاک گھر بھجوا دیے۔ سمجھا کہ اب چند روز کو جان بچی۔ اسی دن شام کو ایک خط آپ کا اور پہنچا۔ اس کو بھی روانہ کرتا ہوں۔ اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصل لکھ چکا ہوں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں، وہ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں مزے کی بات یہ ہے کہ میرا لکھا ہوا میرا حال یاد رہیں۔ اور کسی نے جو کہہ دیا کہ غالبؔ کے پاؤں کا ورم اچھا ہو گیا، اور اب وہ شراب دن کو بھی پیتا ہے، تو حضور نے ان باتوں کو یقین جانا۔ بیس برس آگے یہ بات تھی کہ ابر و باراں میں یا پیش از طعام چاشت یا قریبِ شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب شبانہ معمولی میں مجرا نہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں

ہوئیں۔ بڑے بڑے بتہ بر سے۔ پینا ایک طرف، دل میں بھی خیال نہ گذرا، بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی ہے۔ پاؤں کا ورم حد سے زیادہ گذر گیا۔ مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا۔ کھولن شروع ہو گئی۔ حکما جو دو تین یہاں ہیں ان کی رائے کے مطابق کل سے بیب کا بھرنا بند ہیگا۔ وہ پکا لائیگا۔ تب اس کے پھوڑنے کی تدبیر کی جائیگی۔ تلوا زخمی، پنڈلی زخمی، اگر وہ نامردِ بیدرد جھوٹا ہے تو اس پر ہزار لعنت اور اگر میں جھوٹا ہوں، تو مجھ پر سو ہزار لعنت۔

(۱۰۰)

حضرت۔

آپ کے سب خط پہنچے۔ سب قصیدے پہنچے۔ بعدِ اصلاح بھیج دیے گئے۔ ستر برس کی عمر الام روحانی؛ نہ میں کہوں نہ کوئی باور کرے۔ امراض جسمانی میں کیا کلام! بائیں پاؤں میں جہینا بھرے ورم ہے۔ کھڑے ہوتے میں رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ افعالِ دماغ ناقص ہو گئے۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ قصہ مختصر، ایک قصیدہ سالق کا اور ایک کل کا آیا ہوا۔ یہ دونوں ایک لفافے میں آج روانہ کرتا ہوں۔

جمعہ ۱۳ جولائی ۱۸۶۳ء

(۱۰۱)

میرزا تفتہ۔

یہ غلطی تمہارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباحت یہ ہے کہ "اعم" بہ تشدید لفظ عربی ہے۔ ع

دیگر تو ال گفت اخص را کہ اعم است

مگر بحر اور ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی نویسانِ عجم نے یوں بھی لکھا ہو، کاف کے اسقاط کی کیا توجیہ کرو گے؟ اور پھر اس صورت میں بھی تو بحر بدل جاتی ہے ناچار، اس شعر کو نکال ڈالو۔ میں نے تمھیں قصائد لکھنے کو کہا تھا، اب ہم

منع کرتے ہیں کہ عاشقانہ قصائد نہ لکھا کرو۔ مدح بہ شرط ضرورت لکھو، مگر بہ فکر و غور۔

۱۶، جولائی ۱۸۶۳ء   غالبؔ

(۱۰۲)

یہ سچ ہے اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "بہ روے استادن رنگ" کو کہاں سے سمجھتا؟

ندانم پس از من چہ پیش آیدت   بہ از من نصیحت گرے بایدت

میں نے جو لکھا کہ میں اچھا ہوں۔ اس کو آپ سچ سمجھ کر خدا کا شکر بجا لائے۔ وہ جو میں نے لکھا تھا کہ شدتِ مرض کا بیان مبالغۂ شاعرانہ ہے۔ اس کو بھی آپ نے سچ جانا ہوگا۔ حال آنکہ یہ دونوں کلمے از راہِ طنز تھے۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جب تم نے کسی طرح بیانِ واقعی کو باور نہ کیا، تو میں نے تمھیں لکھ بھیجا کہ اچھا ہوں۔ اور یہ کلمہ تمھیں میں نے جب لکھا ہے کہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک دم میں دم ہے اور ہات میں جنبش قلم ہے، جب تک موقعِ اصلاح خیال میں آسکتا ہے، آج جو تمھارا دفتر پہنچیگا، اس کو کل روانہ کر دیا کرونگا۔

مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب بہ مرگ ہوں۔ دونوں ہاتوں میں پھوڑے، پاؤں میں ورم۔ نہ وہ اچھے ہوتے ہیں۔ نہ یہ رفع ہوتا ہے۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ کل تمھارا دو ورقہ آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اس کو دیکھ کر تمھیں بھجوایا۔ زنہار تم مجھے تندرست سمجھے جاؤ اور دفتر کے دفتر بھیجے رہو۔ ایک دن سے زیادہ توقف نہ کرونگا۔ قریب مرگ ہوں تو بلا سے!

صبح پنج شنبہ۔ ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء   غالبؔ

(۱۰۳)

"انگشتری" اور "خاتم" دونوں ایک ہیں۔ تم نے خاتم بہ معنی نگیں باندھا یہ غلط۔

"جنسِ وفائے کس مخر" کیا ترکیب ہے؟ "جنسِ کس فخرِ وفا" البتہ درست ہے۔ نظرِ اول میں بہ سبب تکدّر حواس اور کثرتِ درد و ورمِ پا کے میں نے خیال نہ کیا ہوگا۔

یہ خط لکھ کر بند کر رکھا تھا کہ کل صبح روانہ کرونگا۔ چشم بد دور، آج اسی وقت کہ دو گھڑی دن ہے، آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ وہ برا جو میں نے خالی چھوڑ دیا ہے۔ اس کو کتر کر، یہ سطریں لکھ کر، پھر بند کرتا ہوں۔

سبحان اللہ!

دیگر نتواں گفت اخص راکہ اعم ست ایں

اس کا وزن کب درست ہے؟ کیا فرماتے ہو؟ غور کرو۔ بعد غور کے اس کی ناموزونی کا خود اقرار کروگے۔

"شرف فرزدقی" کے مطلع میں "ساغرِ غم درکشیدہ ایم" و "دم درکشیدہ ایم" دوسرے شعر میں:

"پیمانہائے زہرِ ستم درکشیدہ ایم"

درکشیدن کو ربط پیمانہ کے ساتھ ہے یا زہر کے ساتھ؟ اگر "زہر درکشیدن" جائز ہوتا تو وہ "سم" کے قافیے کو کیوں چھوڑتا؟ تیسرے شعر میں "قلم در۔ کشیدن" ہے۔ چوتھے شعر میں "آب درکشیدن" ہے، پانچویں میں "سر درکشیدن" ہے۔ کیا زہر پانی ہے؟ اگر بہ مثل "زہراب" ہوتا تو روا تھا۔ سبحان اللہ، یہ عبارت:

"جائیکہ شرف فرزدقی ساغر و پیمانہ زہر درکشید"

اے برادر! شرف زہر کجا درکشید؟ بلکہ پیمانۂ زہر درکشید۔ شما ہم ساغرِ سم درکشید۔ "سم درکشیدن" کجا و "پیمانۂ غم درکشیدن" کجا۔ ہم نے تو تم کو اجازت دی ہے۔ خیر رہنے دو۔ ہند میں اس کو کون سمجھیگا؟ چاہو یوں کر دو ؎

دانی من و دل آنچہ بہم درکشیدہ ایم
دریک نفس دو ساغرِ سم درکشیدہ ایم

سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو۔ ؎

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بداست مرگ، و لے بدتر از گمانِ تو نیست
غالبؔ

خیر، شرف قزوینی کی سند پر وہ مطلع رہنے دو۔

میں ایسا جانتا ہوں کہ "درّاعہ" بہ تشدید ہے اور وہ 'درع' بہ وزن 'زرع' اور لغت ہے۔

صاحب، یہ قصیدہ تم نے ایسا لکھا ہے کہ میرا دل جانتا ہے۔ کیا کہنا ہے! ایک خیال رکھا کرو کہ شعرِ اخیر میں کوئی بات ایسی آجائے کہ جس سے اختتام کے معنی پیدا ہوا کریں۔

ایک قصیدہ اصلاح دے کر بھیج چکا ہوں اور اسی ورق پر فلانے صاحب کے باب میں تم کو ایک نصیحت کر چکا ہوں۔ ادھر کے جواب کا ہرگز خیال نہ رکھو، اور ادھر سے اگر قصیدے کے ارسال میں دیر ہوا کرے تو گھبرایا نہ کرو۔ اب میرے پاس دو قصیدے ہیں۔ ایک "لشکر بر آورم" اور ایک کل آیا ہے: "برجا ماند" و "دریا ماند"۔ خوب کہے، کہ مضمون۔ سے پہلے ممدوح ڈھونڈھنا پڑھتا ہے۔ اگر میں تم کو ممدوح بتا سکتا تو قصیدہ اس کے نام کا تم سے منگوا چکا ہوتا اور اس ممدوح تک پہنچا چکا ہوتا۔ بھائی۔ ایک دقیقہ ہے کہ لکھنے کے قابل نہیں۔ ہاں، ملاقات ہوئے پر کہہ سکتا ہوں۔ اللہ! اللہ!

(۱۰۴)

صاحب۔

"گوہر را"، "خاور را" یہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا۔ ہم نے اصلاح دے کر تمھارے پاس بھیج دیا ہے۔ جب تم صاف کر کے بھیجوگے، ہم تمھارے

ممدوح کو دے دیں گے۔ کل تمھارا یہ قصیدہ پہنچا۔ ہم نے دوپہر کو دیکھ کر درست کیا۔ آج پنج شنبہ ۱۰ ستمبر ۱۸۶۳ کو ڈاک میں بھجوا دیا۔

صاحب۔ آج میر بادشاہ آئے۔ تمھاری خیر و عافیت ان کی زبانی معلوم ہوئی۔ اللہ تمھیں خوش رکھے اور مجھ کو تمھارے خوش رکھنے کی توفیق دے۔ ممدوح کا نام کیا لکھوں؟ بات اسی قدر ہے کہ رامپور میں کوئی صورت کسی طرح بنتی نظر نہیں آئی۔ ورنہ کیا تمھارا قصیدہ وہاں نہ بھجواتا؟

"ذراعہ" کو یہ نہ کہو کہ تشدید نہیں ہے۔ اصل لغت مشدد ہے۔ شعرا اس کو مخفف بھی باندھتے ہیں۔ سعدی کے مصرع سے اتنا مقصود حاصل ہوا کہ "دراعہ" بے تشدید بھی جائز ہے۔ یاد رہے "جادہ" اور "دارعہ" دونوں عربی لغت ہیں۔ وہ دال کی تشدید سے اور یہ رے کی تشدید سے۔ مگر خیر "جادہ" اور "دراعہ" بھی لکھتے ہیں۔ یہ نہ کہو کہ درّاعہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ کہو کہ "دراعہ" بے تشدید بھی جائز ہے۔

غالب

(۱۰۵)

صاحب۔

کشیدن کی جگہ "درکشیدن" و "برکشیدن" بلکہ "برکشیدن" کی جگہ "درکشیدن" نہ چاہیے۔ برآمدن و درآمدن کا استعمال بعض متاخرین نے عام کر دیا ہے یعنی درآید سے برآید کے معنی لیے ہیں لیکن درکشیدن اور ہے اور "کشیدن" اور۔ میں قریب بہ مرگ ہوں۔ پاؤں کے ورم نے اور ہات کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔ باور کرتا اور میرے سب آدمی بلکہ بعض دوست جو روز آتے ہیں، وہ بھی گواہ ہیں کہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ خطوط کی تحریر لیٹے لیٹے ہوتی ہے۔ اشعار اصلاح کو بہت جگہ سے آتے تھے سب کو منع کر دیا۔ ایک رئیس رامپور اور ایک

تم، ان کی اصلاح رہ گئی۔

(۱۰۶)

لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے بہ سبب ذوقِ شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں، تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بہ طریق قہر درویش بہ جان درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

(۱۰۷)

نورِ چشم غالب از خود رفتہ، مرزا آلفتہ۔

خدا تم کو خوش اور تندرست رکھے۔ نہ دوست بخیل، نہ میں کاذب مگر بقول میر تقی۔ ع

آتفاقات ہیں زمانے کے

بہرحال کچھ تدبیر کی جائیگی اور ان شاء اللہ صورت وقوع جلد نظر آئیگی۔ تعجب ہے کہ اس سفر میں کچھ فائدہ نہ ہوا۔

یا کرم خود نماند در عالم — یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

اغنیاے دہر کی مدح سرائی موقوف کرو۔ اشعار عاشقانہ بطریق غزل کہا کرو، اور خوش رہا کرو۔

سہ شنبہ۔ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء — نجات کا طالب غالب

(۱۰۸)

سہ شنبہ، ۳۰ ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ و ششم ستمبر ۱۸۶۴ء

صاحب۔

کل پارسل اشعار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر اور اس پر لکھ کر کہ 'یہ پارسل ہے، خط نہیں ہے' ڈاک بھیج دیا۔ ڈاک منشی نے کہا کہ خطوں کے صندوق میں ڈال دو۔ خدمت گار ناخواندہ آدمی اس کا حکم بجا لایا اور اس کو خطوں

کے صندوق میں ڈال آیا۔ وہ لفظ کہ "یہ خط نہیں ہے، پارسل ہے" دست آویز معقول ہے۔ اگر وہاں کے ڈلیئے تم سے خط کا محصول مانگیں، تو تم اس جملے کے ذریعے سے گفتگو کر لینا۔

مکان میرے گھر کے قریب، حکیم محمود خان کے گھر کے نزدیک، عطار بھی پاس، بازار بھی قریب، ڈھائی روپے کرائے کے موجود۔ مگر مالک مکان سے یہ وعدہ ہے کہ ہفتہ بھر کسی اور کو نہ دونگا۔ بعد ایک ہفتہ کے اگر تمہارا مسافر نہ آیا تو مجھے اور کرایہ دار کے دینے کا اختیار رہے۔ رامپور کے باب میں مختصر کلام یہ ہے کہ نہ میں والی رامپور کو لکھ سکتا ہوں۔ نہ اس نہ لکھنے کی وجہ تم کو لکھ سکتا ہوں۔ اگر کبھی ریل میں بیٹھ کر آجاؤ گے تو زبانی کہہ دونگا۔

(۱۰۹)

بھائی۔

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے قصائد ہی پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے۔ اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینھ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے۔ اور مینھ کی نئی صورت۔ دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالاخانے کا جو دالان میرے بیٹھنے، اٹھنے، سوتے، جاگتے، جینے، مرنے کا محل، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشہ خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمہارے قصائد دیکھے جائیں گے۔ میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمہاری خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے

نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خان صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہینگے۔ بیمار ہیں۔ احسن اللہ خان معالج ہیں۔ فصد ہو چکی ہے۔ جونکیں لگ چکی ہیں۔ اب مسہل کی فکر ہے۔ سوا اس کے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں کوئی شخص نیا۔ تکلف کی ملاقات کا آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں۔ ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ اللہ!

صبح جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۴ء

(۱۱۰)

منشی صاحب۔

میں سال گذشتہ بیمار رہا۔ بیماری میں خدمت احباب سے منقر نہیں رہا۔ اب مردہ ہوں۔ مردہ کچھ کام نہیں کر سکتا۔ کمشنر، ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام شہر سے ترک ملاقات ہے۔ مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضروری۔ اگر نہ ملوں تو مختار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈکر وود صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ ان کی جگہ ریٹیگن صاحب مقرر ہوئے۔ ان سے ناچار ملنا پڑا۔ وہ تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی انھوں نے مدد چاہی۔ میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خان صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے، ان کا حال لکھ بھیج۔ میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے۔ بہ قید اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں، اور اس سواد کی صورت یہ ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر رئیس لوہارو۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں۔

اسد اللہ خان غالب کے شاگرد نواب مصطفیٰ خان بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد

اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اُردو میں مومن خان کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔
منشی ہرگوپال، معرز فانون گو سکندر آباد کے، فارسی شعر کہتے ہیں۔ تفتہ تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد۔۔
ظاہرا بعد اس فہرست کے بھیجنے کے انہوں نے پھر اپنے منشی سے تم کو لکھوایا ہو گا۔ پھر کچھ آپ لکھا ہو گا۔ مجھ کو اس حال سے کچھ اطلاع نہیں۔ تمہارے خط کی رو سے میں نے اطلاع پائی۔ اب میں مولوی مظہر الحق ان کے منشی کو بلواؤنگا اور سب حال معلوم کرونگا اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائیگا۔ صرف شاعر کا اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن و وطن کا نام مع تخلص درج ہو گا۔ خدا کرے، کچھ تم کو فائدہ ہو جائے ورنہ بہ ظاہر سوائے درج ہونے نام کے اور کسی بات کا احتمال نہیں ہے۔ ٹیگو صاحب اب عدالتِ خفیفہ کے جج ہو گئے۔ ڈکرود صاحب پہاڑ سے آئے گو اپنا کام کرنے لگے۔ ریٹیگن صاحب شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر چاہیے معہذا جاڑے کا موسم بڑھاپے کا عالم۔ وہاں تک جانا دشوار و پھر کوئی مطلب نکلتا ہوا نظر میں نہیں۔ بہر حال مولوی مظہر الحق پرسوں یک شنبہ کے دن میرے پاس آئینگے۔ حال معلوم کر کے اگر میرا جانا یا لکھنا تمہاری فلاح کا موجب ہو گا تو ضرور جاؤنگا۔

روز جمعہ ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء   غالب

(۱۱۱)

آؤ مرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ۔ بیٹھو اور میری حقیقت سنو!
یک شنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ ان سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ریٹیگن صاحب کے لکھا تھا پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا۔ دونوں

دیوان تمہارے اور "نشترِ عشق" اور ایک تذکرہ اور یہ چار کتابیں تمہاری بھیجی ہوئی ان کو پہنچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمہارے بہت معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہوگا۔ کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمہارا ذکر بہت اچھی طرح سے لکھیں گے۔ باقی ما بخیر شما بسلامت۔ ہاں ان کے تحت میں پندرہ بیس روپے مشاہرے کے علاقے ہیں۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو اس امر میں ان سے کلام کروں۔

میرا عجب حال ہے۔ حیران ہوں کہ تمھیں میرا کلام کیوں یاد نہیں آتا۔

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بد است مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

سامعہ مر گیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رامپور سو روپے مہینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے۔ عوض خدمتِ سابقہ میں شمار کیجیے۔ تو میں "نمک پیر" سہی ورنہ خیرات خوار سہی۔ اور اگر یہ عطیہ بہ شرطِ خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے، وہی میری قسمت ہے۔ دیرس دن سے ان کا کلام نہیں آیا۔ فتوح مفرری نومبر تک آئی۔ اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہِ جوانمردی دیے جاتے ہیں۔ اور بھائی! تمہاری مشق چشم بد دور صاف ہو گئی۔ رطب و یابس تمہارے کلام میں نہیں رہا۔ اور اگر خواہی نہ خواہی تمہارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے، تو میری جان! میرے بعد کیا کرو گے؟ میں تو چراغِ دمِ صبح و آفتابِ سرِ کوہ ہوں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

۱۴ رجب ۱۲۸۱ھ — نجات کا طالب غالب

(۱۱۲)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ
غالب کی دعائے درویشانہ قبول کریں۔

ہم تو آپ کو سکندرآباد رقاتون گویوں کے محلے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور
آپ لکھنؤ، راجہ مان سنگھ کی حویلی، مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدار یا
حقہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نول کشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں
بھلا، منشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یک شنبہ ہے۔ اخبار کا لفافہ ابھی
تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے تو پنج شنبہ، جمعہ کو پہنچتا تھا۔

مرزا تفتہ کیا فرماتے ہو؟ کیسے ریٹیگن صاحب! کہاں ریٹیگن صاحب!
پنج شنبہ کے دن ۱۹ جنوری سنہ حال کو، وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور
کے ضلع میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں۔ میں اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقات
تو دیع کو نہیں گیا۔ انوار الحق گھاٹ پر نوکر ہیں۔ پندرہ روپیے مشاہرہ پاتے
ہیں۔ زیادہ، زیادہ۔

صبح یک شنبہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء نجات کا طالب غالب

(۱۱۳)

صاحب۔

واقعی "سراب" کا ذکر کتب طبی میں بھی ہے اور عرفی کے ہاں بھی ہے۔
تمہارے ہاں اچھا نہیں بندھا تھا، اس واسطے کاٹ دیا۔ "قراب" کون سا
لفظ غریب ہے جس کو اس طرح پوچھتے ہو۔ خاقانی کے کلام میں اور اساتذہ
کے کلام میں ہزار جگہ آیا ہے۔ "قراب" اور "سراب" دونوں لغت عربی الاصل
صحیح ہیں۔

غالب

(۱۱۴)

حضرت۔

اس غزل میں 'پروانہ' و 'پیمانہ' و 'بت خانہ' تین قافیے اصلی ہیں۔ 'دیوانہ' چونکہ علَم قرار پاکر لغت جُداگانہ مشخص ہوگیا ہے، اس کو بھی قافیۂ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی غلامانہ 'و مستانہ' و 'مردانہ' و ترکانہ' و دلیرانہ' و شکرانہ" سب ناجائز و نامستحسن۔ ایطا اور ایطا بھی قبیح۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایطا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں اور پھر تم نے غزل مبنی انھیں قوافی پر رکھی۔ "کاشانہ" و "شانہ" و "افسانہ" و "جانانہ" و "فرزانہ" یہ قافیے کیوں ترک کیے؟ یاد رہے ساری غزل میں 'مردانہ' یا 'مستانہ' یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظری ہوگئی۔ اور غزل لکھ کر بھیجو، تا اصلاح دی جائے۔

عفو کا طالب غالب

(۱۱۵)

مرزا تفتہ، پیر شو و بیاموز۔

تم خوش گو اور زود گو مقرر ہو۔ لیکن جس کو تم تحقیقات کہتے ہو وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو۔ وہ قیاس کہیں مطابقِ واقع ہوتا ہے۔ کہیں خلاف۔ عرفی کہتا ہے۔ ؎

روح را ناشتا فرستادی

یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا۔ "ناشتا" اس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ ہندی اس کو "نہار منھ" تم لکھتے ہو۔ ؎

کہ عجب ناشتا فرستادی

یعنی غذاے صبح، جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے: "اس نے ناشتہ بھی کیا ہے یا نہیں؟"

واقف کہتا ہے :

نے محرم قفس، نہ بدام آشنا شدیم — نفریں کنیم ساعت پرواز خویش را

یہ بھی ہندی کی فارسی ہے : "بُری گھڑی" اور "سبھ گھڑی"۔ اہلِ زبان ایسے موقع پر "طالع" لکھتے ہیں : ع

نفریں کنیم طالع پرواز خویش را

قتیل کہتا ہے ے

یک وجب جائے بکوے تو زخون پاک نبود — کشتہ بر کشتہ تپاں بود، دگر خاک نبود

یہاں "ہیچ نہ بود" کا محل ہے۔ ہندی میں "کچھ نہیں" کی جگہ "خاک نہیں" بولتے ہیں۔ اور پھر صاحب "برہان قاطع" کا کیا ذکر کرتے ہو۔ وہ تو لغت کو تینوں حرکتوں سے لکھتا ہے۔ "زبر" "زیر" "پیش" کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا ہے لکھتا ہے کہ یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی دیکھا ہے۔ جس لغت کو کاف عربی سے لکھیگا، کاف فارسی سے بھی بیان کریگا۔ جس لفظ کو "طائے حطی" سے لائیگا تائے قرشت سے بھی ضرور لکھیگا۔ فضلائے کلکتہ کے حاشیے دیکھو کہ وہ اس کی کیا تحقیق کرتے ہیں! "نبیا" نبوت کے مشتقات میں سے ہرگز نہیں۔ "امامن" امام کے مشتقات میں سے زنہار نہیں۔ نبی بخش کا مخفف "نبیا"، امام کا متعلق اگر مذکر ہے تو "امامی" اور اگر مونث ہے تو "امامن"۔ طغری نے ہندی لغت کے لانے کا التزام کیا ہے ع

وقت آں آمد کہ بینا راگ ہندی سر کند

اور اساتذہ کو اس کا التزام منظور نہیں۔ مگر کیا کریں؟ "گڑگانواں" نام ہے ایک گاؤں کا، اس کو کیوں کر بدلیں؟ ہاں "گڑ" بہ رائے قرشت لکھینگے۔ لکھنؤ نام ہے ایک شہر کا۔ وہ "لکنو" بغیر ہائے مخلوط کے کہینگے۔ فی زمانا "چھاپے" کو "چاپ" بولتے ہیں۔ حزّیں "جھگڑ" کو "جگر" بولتا ہے۔ ع

آں یاد کہ در ہند گر آید جگر آید

رائے ثقیلہ، ہائے مخلوط، تشدید یہ تینوں ثقالتیں مٹا دیں۔ صاحب برہان قاطع
اس لفظ کو فارسی بتاتا ہے اور زبان علمی اہل ہند میں بھی اس کو مشترک جانتا ہے
اپنے کو رسوا اور خلق کو گمراہ کرتا ہے۔ ع

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار — اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو، تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔ گائے کا بچہ بہ زورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔ یہ جھگڑے قصے جانے دو۔ دو باتیں سنو:

ایک تو یہ کہ "ارغنون" کو بہ عینِ مضموم میں نے سہو سے لکھا، دراصل "ارغنون" بہ غینِ مفتوح اور مخفف اس کا "ارغن" اور مبدل منہ "ارگن" ہے۔

دوسرے یہ کہ جب موسوی خان نے "ایوائے" کو "ایوا" لکھا تو اس لفظ کی صحت میں کچھ تامل نہ رہا۔

رامپور سے اپریل مہینے کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب آگیا۔ آیندہ جو خدا چاہے۔

یک شنبہ ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء — نجات کا طالب غالب

(۱۱۶)

صاحب۔

تم نے "تن تن" کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ لکھا نہ تھا۔ "تن تن" اور "تننا" اصوات ہیں تار کے۔ ہندی و فارسی میں مشترک۔ "بنیا" اور "امامن" کے لکھنے کو میں نے منع ہرگز نہیں

کیا، شوق سے لکھو۔ یہ تم کو سمجھایا تھا کہ "نیبا" مخفف نبی بخش اور "امامن" متعلق بہ امام ہے۔ مشتقات میں سے اس کو تصور نہ کرو۔ قاعدہ دانان اشتقاق تم پر ہنسینگے۔

"ایوا اے" کے جتنے شعر تم نے لکھیں ہیں، سب مانع ہیں! "ایوا" کے اور سند "ایوا اے" کی یہ موسوی خان نے بہ حسب ضرورت شعر "ایوا" لکھا ہے۔ "تہمتن" "برہ و زن" "قلم زن" ہے۔ فردوسی نے سو جگہ شاہنامے میں "تہمتن" بہ سکون ہائے ہوز لکھا ہے۔ پس کیا اس لغت کی دو صورتیں قرار پاگئیں؟ لاحول ولاقوۃ! لغت وہی بہ حرکت ہائے ہوز ہے۔

میں نے کس قدر کلام کو طول دیا۔ صائب کے شعر کی حقیقت شرح و بسط سے لکھی۔ تم نے ہرگز اعتنا نہ کیا۔ "ایوا" کو الگ سمجھے، "مصیباہ" کو جدا سمجھے۔ بھلا میرے قول کو "گوز شتر" سمجھتے ہو؟ ترا "مصیباہ" یا "حسرتاہ" برہان قاطع میں یا بہار عجم میں ہم کو دکھا دو۔ وہی "وائے" ہے کہ جب اس کے بعد "مصیبتا" یا "حسرتا" یا "ویلا" آتا ہے، تو تحتانی کو حذف کر کے "واویلا" وغیرہ لکھتے ہیں۔ چاہو "اے واویلا" لکھو، چاہو "واویلا" لکھو، چاہو آخر میں ہائے ہوز لکھو جیسا کہ "وامصیبتاہ" چاہو بے ہائے ہوز "وامصیبتا"۔ اور یہی حال ہے حسرت، و "درد" و "اسف" و "دریغ" کا۔ جہاں "اے" کے ساتھ "وامصیبتا" پاؤ، وہاں "اے" کو حرف ندا اور منادی یعنی "ہم نشیں" اور "ہمدم" کو مقدر سمجھو۔ فرہنگ لکھنے والوں نے اشعار قدما میں ترکیبیں دیکھیں۔ اپنا قیاس دوڑا کر اس کی حقیقت ٹھہرائی۔ کہیں ان کا قیاس غلط، کہیں صحیح۔ سو ان میں یہ "دکنی" ایسا کج فہم ہے کہ اس کا قیاس سو لغت میں شاید دس جگہ صحیح ہو۔ میں نے تو صاف لکھ دیا تھا کہ موسوی خان کے شعر کی سند پر "ایوا" کو بہتے دو مگر صائب کے شعر میں "ایوا" کو الگ اور "مصیباہ" کو جدا نہ سمجھو

تمھارے قیاس نے پھر تمھیں کہیں کا کہیں پھینکا، اور تم نے بھی کہا کہ صائب نے "ایوا" لکھا ہے۔

نجات کا طالب غالبؔ

(۱۱۷)

دل لیے داغ دار بود و نماند ۔۔۔ در نظر ہا بہار بود و نماند

اگر "بود" کے آگے داغ کو موقوف اور محذوف کر دو گے، تو ہمارے نزدیک کلام سراسر بلیغ ہو جائیگا۔

میری جان! جو خجالت کہ مجھ کو تم سے ہے، شاید یہ سبب عبادت نہ کرنے کے قیامت میں خدا سے بھی نہ ہو گی اور بہ سبب خلاف شرع کرنے کے پیمبر سے بھی نہ ہو گی۔ مگر خدا ہی جانتا ہے، جو میرا حال ہے۔

مرگ ناگاہ کا طالب غالبؔ

(۱۱۸)

میاں، سنو۔

اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے جیسے ہم تم اپنے مسائل دینی سے۔ بلکہ ہم تم با وجود عدم واقفیت امور دین سے نفور نہیں اور وہ شخص اس فن سے بیزار ہے۔ علاوہ اس کے وہ اتالیق کہاں؟ وہاں سے نکالے گئے، دلی میں اپنے گھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب سے آئے ہیں ایک بار میرے پاس نہیں آئے۔ نہ میں ان کے پاس گیا۔ یہ لوگ اس لائق بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے، چہ جائے آں کہ ممدوح کیجیے۔ ہائے انوری۔

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوارِ غزل

غالبؔ

(۱۱۹)

میرے مہربان، میری جان، میرزا تفتہ سخندان۔

تمہارا سکندرآباد اور میرے خط کا تمہارے پاس پہنچنا، تمہاری تحریر سے معلوم ہوا۔ زندہ رہو اور خوش رہو۔ میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت! نواب صاحب از روے صورت، روحِ مجسم، اور بہ اعتبارِ اخلاق آیتِ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے۔ اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلے کا محصول معاف کر دیا ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کر دیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نول کشور کی عرضی پیش ہوئی خلاصہ عرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بہ تقریبِ شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔ بھائی مصطفیٰ خان صاحب بہ تقریبِ تہنیت مسند نشینی و شمولِ جشن آنے والے ہیں۔ اس وقت تک نہیں آئے جشن یکم دسمبر سے شروع، پنجم دسمبر کو خلعت اتا مسموع۔

دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء، وقتِ چاشت

نجات کا طالب غالبؔ

(۱۲۰)

لو صاحب۔

کھچڑی کھائی، دل بہلائے کپڑے پھاڑے، گھر کو آئے

۸ جنوری کی مال سالِ حال[1] دوشنبے کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے

---

[1] یعنی ۱۸۶۶ء

گھر پر نازل ہوا۔ تمھارا خط مضامینِ دردناک سے بھرا ہوا رامپور میں ہونے
پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچکر بیمار
ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے تیمارداری
اور غمخواری بہت کی۔

کیوں ترک لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا جس کو اتار کر
پھینکو گے؟ ترک لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائیگی۔ بغیر کھائے پیئے گذارا نہ ہوگا۔
سختی و سستی، رنج و آرام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو، اسی صورت سے بہر صورت
گزرنے دو۔

تاب لائے ہی بنیگی غالب — واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اس خط کی رسید کا طالب غالب

(۱۲۱)

میرزا تفتہ صاحب۔

پرسوں تمھارا دوسرا خط پہنچا؛ تم سے پردا کیا ہے؟ ایک فتوح کا منتظر ہوں
اس میں میں نے اپنے ضمیر میں تم کو شریک کر رکھا ہے۔ زمانہ فتوح کے آنے کا قریب
آگیا ہے۔ انشاء اللہ خط میرا مع حصۂ فتوح جلد پہنچیگا۔ پنڈت بدری ناتھ یا
بدری داس، ڈاک منشی کرنال یا آل کر، مجھ سے ملاقات ظاہر ہی نہیں ہے۔ مگر میں
جب جیتا تھا، تو وہ اپنا کلام میرے پاس اصلاح کے واسطے بھیجتا تھا۔ بعد اپنے
مرنے کے میں نے اس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس
بھیج دیا کرو۔ اب تم کو بھی لکھتا ہوں کہ تم میرے اس لکھنے کی ان کو اطلاع لکھو۔

میں زندہ ہوں۔ ادیٹر کے لیٹر میں جو اپنے کو مردہ لکھا ہے، وہ باعتبار ترک
اصلاح نظم لکھا ہے۔ ورنہ زندہ ہوں، مردہ نہیں، بیمار بھی نہیں، بوڑھا، ناتواں،
مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا
امیدوار۔ غالب

(۱۲۲)

حضرت۔
اس قصیدے کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں! لیکن افسوس کہ بیجل اور بیجا ہے۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہٖ وہ حال ہے کہ ایک مریلے پر سیب کا یا بہی کا درخت اُگ جائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے دکان بے رونق کے خریدار رہو۔

(۱۲۳)

میرزا تفتہ کیا کہتا ہے۔ نہ ظہیر کا پتا نہ غالب کا۔ مدّاحِ شایستہ صد ہزار آفریں، اور ممدوح سزاوارِ نفریں!

oooooooo O oooooo

دیباچہ دیوان منشی ہرگوپال تفتہ

مرقومہ مرزا اسد اللہ خاں غالب

ہاں اے غالب تیرہ روز و ژم اختر کہ بدیں ہستی و کسائی کہ تراست بدان
ماتی کردانی در عالم فرض محال! سپندی دیدہ ایم بر آتش آرمیدہ۔ اللہ اللہ
چہ مایہ جوش سوداست کہ ہر نفسی کی می کشی چوں خطی کہ از نقطہ برآورند ہمرنگ
سویداست۔ آں قلمرو اندیشہ کہ از روانی خامہ و روانی گفتار آب و
ہوا داشت دی مہش را فرو دین پرستار بود و چاشت گہش را نسیم
سحری پیش کار۔ بدیں تا خوشی و تشرندی دبر آں چیراست سبزہ را چہ افتاد
کہ بجمیدن دل از دست تماشائیان بزد و غنچہ را چہ ردی داد کہ بدمیدن
پردۂ شکیب نظارگیاں نہ درد۔ نظم ے

آں اثر پردۂ سازت چہ شد — زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد
آں ز جنوں پردہ کشائیت کو — ولولۂ سلسلہ خائیت کو
آں نفس تا کہ کمندت کجاست — واں نگہ جلوہ پسندت کجاست

گفتی کہ سوز غم دود از دل برآورد و گداز نفس آور در زبان زد یادے
کہ ہر آئینہ تگ در اخت و یا زبانی کہ ہمانا نسوخت غدر غمزدگی مسموع نیست
بیا تا ہمیں دل بد زہرۂ الحذر نوائے را سخن تہنیم و ہمیں زبان کثر نغمۂ الامان لمؤ

سرائی را بگفتار آوریم۔ مژه را که بپالودنِ خونِ دل به دُرد شیشه آغشته تو بتو بهم چسپلیده بریزش ایں خونِ گرم که دما دم در جگر جوش میزند بخیه از هم گسلیم و دیده راهم چناں خونابه چکاں پیروی بهار کشائیم۔ نظم ؎

زمیں جوی دربدکو زیستن   جگر خوردن و تازه روز لیستن
سمن چیدن و در ره انداختن   دل افشردن و در چه انداختن
رواں کردن از چشم همواره خون   بشورابه شستن ز رخساره خون
شگفتن ز داغی که بر دل بود   نهفتن شراری که در دل بود

بهرو را بر رهگزاری مرغزاری در نظر آورده و دربیابانی بخیابانی در آورده اند که دراں تماشاگاه تا بپویه نیم گام زند موج سبزه را یلند تا کمر رسیده و دراں خرامش جا تا بر خویشتن جنبد گوشهٔ دستار را گمرد از گرانیِ بارِ گلِ خمیده سخن بس که بپیچیدگی گذارده آمد اگرچه دراز بود به کوتهی نرود از کشاکشے که در نوردِ بیان روید او قماشِ استعاره که نقابِ عارضِ سخن است از هم گسست۔ همانا رهگزاری که بسبزه زاری انگشت نما شده، بیابانی که نه خیابانی روشناس آمده همیں غالیه اند وه سواد مردمک مداد دہمیں ریحاں رقم صحیفه مشکیں سواد است که در نظر داشته ایم و نی بینوا را بدیباچه نگاری آں گماشته۔

یارب ایں سخن پیوند دانشمند در فنِ فرزانگی یگانه و در آیینِ یگانگی فرزانه آسمانِ سخن را ماهِ دو هفته منشی هرگوپال تفته که ایں فهرستِ گنج خانهٔ راز رقم کردهٔ اوست و ایں مجموعهٔ سوز و گداز فراهم آوردهٔ او چه مایه دیده و دل باهم آمیخته باشد، تا ایں نقشِ بدیع انگیخته باشد. سخن عشق و عشقِ سخن کلام حسن و حسنِ کلام را بیک دگر سرشتند تا چار آخشیجِ هستی شیوا بیانی سر انجام یافت که از گرمیِ نفس و تشنگیِ جگر که در سخن بسخن داشت، بمناسبتِ برشتگیِ حسنِ گفتار تفته نام یافت و دانشناسان سال نشناسند و اندازه داناں دانند که یا آنکه خامه در کفتِ سخن زرا از فراوانی از ورزشِ فنِ سخن لاابالی پوی و

بے پروا خرام است، سخن بہ نغزی و خوبی و روانی در نفسِ خویش تمام است۔ آدمی
سخن اگرچہ بصورت نتیجۂ جنبشِ قلم است، امّا بمعنی از وابستگانِ سلسلۂ دم ست
لاجرم باچنیں دمِ گرم کہ ہیچ گہ دلش را از گفتار سر دندارد، سینہ مستیِ مے سخن
تفتہ از خود رفتہ و در سخنہائی آمدہ ہم آور دندارد۔ زیں پس از مرحلۂ سخن
گزاری کہ ہنجارِ دیباچہ نگاری است، در میگزرم و گذاردنِ حقِ ستائشِ
خوبیِ سخن بدیدہ وراں و میگزارم۔ سخنور را سروش آموزگار و سخنش
ز جہانی بہ آفریں گوئی حق گزار یاد۔

ooooooo ⊕ ooooooo

انتخابِ کلام

انتخاب از سُنبلستان

بنامِ خدائے جہانِ آفریں — زمین آفریں، آسماں آفریں
بہر ذرّہ مِہر و بہر سایہ نور — بہر نور را او صد تماشای طور
بہر برگ رنگ و بہر غنچہ بُو — بایں رنگ و بُو جابجا سُو بسو
ز ماہی بود عشقِ او تا بماہ — خدا را تواں کرد یاراں نگاہ
ز تنہا یہ اشکِ خود است ابرِ غرق — خرد شاں بود ار عدو بیتاب برق
مداں قطرہ را اینکہ ابر زد فرو — زند بر زمیں سر کہ دور ست ازو
دگر دل برو زِ سیاہ از فراق — شفق غرقہ در خون کہ آہ از فراق
چہ صبح و چہ شام آشنای درش — شب و روز گرداں بگردِ سرش
چہ ثابت چہ سیارہ دل فروز — بحیرت شب اندر رہ گم از خود بروز
گر آب است، بود است آتش بجاں — تپاں بر سر خاک و ہر سو رواں
دگر خاک را بیں افتادہ است — تن اندر رضا سر بسر دادہ است
کند میل بالا اگر آتش است — کہ ماوای بالائے تر دلکش است
چناں در ہوائے وی آشفتہ باد — کہ گر گفتہ باشیم، نا گفتہ باد
بہر در مسافر، بہر کو غریب — نہ جای سکونش، نہ جای شکیب
چو آں چارہ را باشد ایں مردمی — از آں چارہ بود است خود آدمی

نداند گر انداز پروردگار — ندانم نش آدمی زینهار

بیک کن چها کرده و میکند — صد احسان بما کرده و میکند

چه روم و چه رے چار سو جلوه گر — بچشم خدا بیں خود او جلوه گر

پری آفرید و بشر آفرید — مجز ایں هر چه باید دگر آفرید

بصلب و رحم راهِ معنی کشود — بیک قطره آب آنچه باید نمود

چنیں کرد و بعد چنیں کرد نش — چه گویم چه داد از پے خوردنش

دگر ساخت از حکمتِ دل پذیر — گہے طفل، گاہے جواں، گاه پیر

دل و دیں عطا کرد و عقل و تمیز — رہد تا ز خواری شود تا عزیز

پے دیدنِ صنع چشم آفرید — کس از نرگس د تا چه بایست دید

ز رحمت نصیحت شنو گوش داد — اگر نشنود داد از آں گوش داد

بیکتائی خود زبانها کشود — زبانِ شکرِ ایں خود چه خواهد نمود

ز بهرِ دعا دستها راست کرد — اگر بر ندارد، دریغ است و درد

بخشید پای از برای سفر — نخیزد گراں پای خاکش بسر

سفر هم خوش آں کز پے حج بود — دگر راه بر راستاں کج بود

جبیں کر موجود بهرِ سجود — چه شود از جبیں در سجود ار نسود

زہے آنکه ایں جمله کرد و دگر — کند پر چه ناید بفهم بشر

یکے اول آورد دیگر روی کار — دگر زد بر آورد چندیں هزار

سببِ تالیفِ کتاب

زمانیکه گشتش ده و هفت سال — ز گردوں بسی داشتم خسته حال

نه مشفق، نه همدم، نه امیدگاه — همان در دل آوخ، همان بر لب آه

مشوش که آیا چه سازم کنوں — نه دل ماند نی جان چه یازم کنوں

ولیکن نظر بر خدا هر نفس — که غیر از خدا کیست فریاد رس

گزر اتفاقاً بگول اوفتاد — شوی شاد گر بشنوی روداد

مردمان بخوبیرت و حق شناس — صفای درونش برون از قیاس
مهی که بابی کرم خود هزار — رحیمی که در رحم آورد بیشمار
ترحمینے که تو دارد شرف بر جهان — لطیفی که لطفش بمسر دم عیان
خلیقے که خلقش باآل آب وتاب — جوادیکه جودش ندارد حساب
از وجملہ بر قدن از وجملہ کو — بناشد کسی کو بناشد ازو
فریاد مردم لبسی زود رس — چنان زود رس تا چه بوداست کس
اگر چه مسیم نامش از خوش دلی — خود اول ظهور است و آخر علی
طلبگار من بود از سالها — زوی بهر بر خورد من فالها
چو بشنید این کو لشهرم رسید — بر آورد حق گوئی اودا امید
فرستاد وارث علی را بمن — بمهر توی و وداد کهن
چه وارث علی ناز پرورده اش — بلطف دگر در هر آورده اش
جگر پارهٔ از جگر پارگان — بدل چاره فرمای بے چارگان
همه انتعاش و همه انبساط — بتو عیکه باید مهیا نشاط
بچشم پدر مانده مانند نور — رهش تا دل از دیده بسیار دور
بمو سنبل تر بر و نسترن — بلب ارغوان و بقد نارون
گلستانی از حسن پیشِ نظر — تماشائیان را بهارِ دگر
نگه بر نمی گشت از روی او — که میداشت دامِ دگر موی او
نمی باشد از تن عیان گرچه جان — ز پیراهن او تن او عیان
سخن عاجز اندر سخن دانیش — که آرد سخن بر سخن دانیش
برون از قیاس و فزون از گمان — دگر هر چه گویم فزون تر از آن
بطرز پسندیده بعد از سلام — نشست از سر صدق و کرد این کلام
کت لسکا فقته والد دعا گفته است — بخوش گوئیت مرحبا گفته است
دگر خواهد از مدتے دیدنت — نخواهد دگر یار گردیدنت

تو آنی که میلِ دلش سوی تست — پسندش همه خوی نیکوی تست
بیک روز صد بار یادِ تو بود — بیادِ تو ذکرِ وددادِ تو بود
بغیبت ستودی ترا بارها — باستادیت کردی اقرارها
کلامت به اهلِ صفا می نمود — تو گوئی بهر یک ترا می نمود
منم آن که بشنیده ام زو بسی — که نشنیده ام بجز فلانی کسی
دل آزاده مردیکه من دانمش — خوش افتاده فردیکه من خوانمش
نه از لطفِ کس خاطرش شاد و خوش — نه از رنجشِ کس دلش رنج کش

یکی آنکه غیر از غزل مثنوی — نگفتم هنوز از طریقِ نوی
بگفتم که طی گردد این راه نیز — که هست اندرین راه بسیار چیز
دگر اینکه ماند ز راه وداد — سخن از محمد سلیمان بیاد
که او را شنیدم بسی نیک مرد — بجز نیکی آن مرد کاری نکرد
ز من هم سزد در حقش نیکوی — ازین مثنوی تا چه این مثنوی
بروحِ لطیفش دعا با رسد — ز خوانندگان مرحبا با رسد
چو گردم دو چارش بروزِ جزا — بگوید که ای گفته، رحمت ترا
دگر ذکرِ آنان که آرم درین — از آنان رسد هم بمن آفرین
جز این هرچه از مهر و کینِ کسان — هم از داد و بیدادِ اهلِ زمان
ز موت و حیات و غم و عیش دهر — ز پست و بلند و زمین و سپهر
ز کجبازی و راستیهای خلق — ز پشمینهای نو و کهنه دلق
ز ایمان و کفر و بهشت و سقر — ز بیداری و خواب و نفع و ضرر
ز هشیار و مست و نشیب و فراز — ز سلطان و درویش و ناز و نیاز
رقم می زنم دیدنی بوده است — که ننمودنی گفته بنموده است
هزار و دو صد بود و هفتاد و هفت — که شد کار ختم و دل از خویش رفت

چوں ایں نسخہ را نام از روی داد / خود استاد من سنبلستان نہاد
ہمیں گشت تاریخش ای جان من / چرا نتگری سنبلستان من
دگر با بہا یکہ ہست اندریں / نشین ساز ہمت تا ہمہ دل نشیں
یکی باب حق بینی است و رضا / نکوکاری و زہد و فقر و فنا
دوم در ظرافت، سوم در حسد / چہارم یا بلیسی مرد بد
بہ نیک و بد شاعران پنجمیں / ششم راستی را بود بالیقیں
بکید زناں ہفتم آمد دگر / بجز نام خدمت بہشتم مبر
بہ عشق و محبت نہم بودہ است / دہم مسلک موت بیہودہ است
دہ و یک کند آگہ از انتقام / دہ و دو بذکر مصنف تمام
بُد ایں جا دہ و دو امام مراد / دہ و سہ بختم اندر آمد زیاد

حکایت از خالقِ عالم تبارک وتعالیٰ

خدائے جہان آفریں گفتہ است / بہ اہلِ جہان ایں گہر سفتہ است
کہ بینم نہ در صورت و فعلِ تان / مگر در دل و نیتِ تان نہاں
خرد بندۂ ہر کسی کز کسی / بگیرد از و کار و خدمت بسی
دگر ہیچ مزدش نہ اصلا دہد / نہ داد عرق ریزی او را دہد
بگوید کہ تو بندہ ہستی مرا / زبردستم و زیردستی مرا
ترا مزد بر من نباشد روا / مزن از پیٔ مزد بر من نوا
خمش ماند و ہیچ خواہد نہ زر / بجز جان خود باز کاہد ز زر
ستم آنکہ ہر بندہ کارم کند / بہر کار خوش روزگارم کند
من او را دہم مزد و خوشدل کنم / طرب بیش زاندازہ حاصل کنم
پس ایں لطف جائیکہ ہست از خدائے / ز عفوش من و ناامیدی چہ جائے

حکایتِ دیگر

بگوید خدای زمین و زمن / کنم نیکی با زلیخا کہ من

بود در حقیقت پی آنکه اوست — بجان دوستم را هر آئینه دوست
پس آنکس که خود دوست با من بود — نه یک ذره اش فرق تا من بود
درین صورتت یادش بود دوست — بهشت و دگر هرچه خواهی در وست

حکایت حضرت داؤد علیہ السلام

بداؤد وحی آمد از کردگار — که ای بر تو جان ملائک نثار
بیا و شنو آنچه فرمایمت — نشین و نگر هر چه بنمایمت
که بشناخت هر کو مرا یاد داشت — وزان یاد هر دم مرا شاد داشت
وگر قصد من کرد و زان بعد جست — وزان جستنم یافت با طبع چست
چو ام یافت از حد نگهداشت بیش — نگهداشتن بردش آنکه ز خویش
بنوعی که در کس نگاهی نه کرد — بضبط نگه غیر آهی نه کرد
پس آنگاه داؤد این عرض کرد — بصد عجز و زاری بصد سوز و درد
چه باشد جزای کسی کو ز دل — بیاد تو هر دم بود مشتغل
بفرمود آنست کانرا که من — کنم مبتلای خود از جان و تن
بحال و دل او را رعایت کنم — تفقد تمایم عنایت کنم
درین حال شو مبتلایش کرد — صد امید یابی هزار آرزو

حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام

شبی موسیٰ از فرط اندوه و درد — بدرگاه یزدان مناجات کرد
که کوته بمن کن زبان خلق را — ز کیفیتم ده نشان خلق را
ندا آمد از غیب کای حق شناس — شناسائی تو برون از قیاس
نه چیزیکه کردم پی خویشتن — پی تو کنم چون و کوشم چه من
همانا نرست از لعنت کسی — بدینا بود نکته چینی بسی
توان بود از نکته چین بر کران — از و ورنه ماتی چها سر گران

حکایت در ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام

بہ پرسید از عیسیٰ این راز کس — کہ اے رحمت حق بتو ہر نفس
بر آنکہ در خانہ بندش کنند — دریں رنج و محنت پسندش کنند
رسد آب و ناں از کدامیں سبیل — نہ بد پس چساں از کدامیں سبیل
بگفت از سبیلی کہ آید اجل — رُخ خویش اورا نماید اجل
پس این جا چہ گوید کس از شان حق — رسد ہر زماں نعمت از خوان حق

حکایت از محمد مصطفیٰ صلعم

روایت بود از رسول خدائے — پیٔ مردمان پسندیدہ رائے
کہ این پنج چیز است از پنج گنج — فزوں تر بسے در سرائے سپنج
شما کردنش را شوید ار کفیل — نیارید ہیچ اندر و قال و قیل
کنم من کفالت برائے بہشت — کہ باشید در قصرہائے بہشت
یکی آنکہ با کس زنید آنچہ حرف — بود راست و آں راست ہم پس شگرف
دوم وعدہ ہرچہ با کس دہید — با ایفائش از راستی دل نہید
سوم بسپرد آں امانت کہ کس — نیارید در دادنش پیش و پس
چہارم تن خویش را از حرام — بدارید محفوظ ہر صبح و شام
جز این نیست پنجم کہ بکشید دشت — زنان حرام و بدی ہرچہ ہست
بحالیکہ این وعدہ است از رسول — و زانسب بی شبہہ مطلب حصول
مرا این پنج را چوں نہ از دل کنیم — چرا ہشت جنت نہ حاصل کنیم

ایضاً

رسول خدا گفتہ است این سخن — کہ شافع شوم روز محشر ز من
کسی را کز و پیر حرمت ندید — کسی را کز و طفل شفقت ندید
کسی را کہ دل بر برادر نسوخت — کسی را کہ آزادہ مردی فروخت
خوشا آن کہ این چار را برگزید — دگر بے تکلف بجنت رسید

حکایت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ

یکے از نظر کردہ ہاے علی   ہمیشہ بدولت سراے علی
زنے بود در رہ یسے خوب رو   نظر کرد از مہر و شفقت در و
بدولت سرا آمد آنگہ فرود   ادا نیز کرد آں قواعد کہ بود
دو زانو نشست از ادب سرنگوں   نکو از بروں ماندہ پیدا ز دروں
بروشن ضمیری علی یافت آں   کہ در راہ دیدا و زنی را چناں
بفرمود در بزم آمد کسے   کہ یار دریار از نگاہش یسے
خوشا آں غیب دانی و روشن دلے   رموز نہانی و روشن دلے

حکایت از ابوبکر صدیقؓ

سخن اینکہ گویم سراسر دُر است   زحلم ابوبکر دفتر پر است
بادیک مجوسی یسے سخت گفت   سر آورد در جیب و یک یک شنفت
وزاں پس بفرمود کای خوش سخن   فدای سخنہات صد ہمچو من
بمن ہر قدر عیبہا بودہ است   ترا آگہے زاں کجا بودہ است
ندانی تو ہرگز یکے از ہزار   ولے جملہ داند خداوندگار
زہے آں حلیم وزہی آں کلام   تو گوئی کہ شد حلم بروی تمام

حکایت حضرت امام ابو حنیفہ

بزرگان دیں مجلس آراستند   پیٔ بو حنیفہ ہمیں خواستند
کہ قاضی شود زانکہ دیں پروری   دری عہد نبود جز او دیگری
اباکرد کیں را نہ من درخورم   برنج اندر آیا یسر چوں برم
دگر کرد انکار و گفتا پناہ   نشایم من ایں کار را ہیچ گاہ
گرم صادق ایں گفتہ باور کنید   تلاش از پیش شخص دیگر کنید
وگر گفتہ ام کذب کاذب کجا   بود قاضی اندر شریعت روا
رہائی غرض زیں ظرافت بیافت   پس از شکر یزداں بمسجد شتافت

کہ آرد چنیں نکتۂ دل پذیر | برآں گروہ تلا طوں نظیر
نہ قاضی منم نے شرلعیت شناس | ولے دانم اورا حقیقت شناس

حکایت بایزید بسطامی

شنیدم بگوشِ دل بایزید | شبے از فلک ایں ندادر رسید
کہ از دل اگر خواہیم پیشم آر | تو چیزیکہ نبود مرا زینہار
بگفتا خود آں چیست بر ہیچ جائے | کہ نبود ترا زینہار اے خدائے
بفرمود خواری و عجز و نیاز | دگر زاری و درد و سوز و گداز

باب دوم در ظرافت

حکایت

ظریفے بہ پیش امیرے نشست | بآں سربلندی کہ او گشت پست
بپرسید دیگر بشوخی ازو | کہ نام پدر چیستت باز گو
امیر از غضب گفت کای قلتباں | چہ شد از دلت رفت چون ہم جاں
بگفتا کہ معلوم شد ای پسر | ولے نام جد ہم بفرما دگر
امیر از ظریف ایں سخن چوں شنید | خمش ماند از جبہہ اش خوی چکید

حکایت

پدر مردہ را حکایت شنو | دگر مردہ خود ازاں زندہ شو
شنیدم کہ یک رند بایک امیر | بگفتا بخواب من گوشہ گیر
پدر آمدت دوش دا از نیکوے | بمن گفت گر بر در من روے
دہد پنج دینار پور منت | برد رنج یکبار پور منت
پس ایں لحظ پیش تو من آمدم | پے صحت آں سخن آمدم
زبس بود ابلہ فریب آں امیر | بگفتا صد ابلہ بدامت اسیر
مرا ہم پدر شب بخواب آمداست | دگر با من ایں حرف یکسر زداست

گر گره پیش آید فلاں حیله گر — بزنی پنج شش کفش او را بسر
چو رندا ز امیر ایں سخن را شنفت — بسر کوفت دست تہی را و گفت
عجب بود شیطاں عجب قلتباں — که با من چنیں گفت و با تو چناں

باب سوم در حسد

حکایت

یکے با من از خبث کیں داشتی — ز نامم گره بر جبیں داشتی
نگفتی سخن کو نخستی جگر — نمک بعد خستن فشاندی دگر
مرا دوست خواندی و دشمن بجاں — بدا دوست کو دشمن من چناں
سوال مرا انچه دادی جواب — دل و جاں بیک بار کردی کباب
زمے خورد دل من جگر خورد نش — نه بر خوردنش به ز بر خوردنش
من از صلح آوردمے حرف و او — هماں فتنه پرداز و پیکار جو
ز من ذکر بام و ازو ذکر شام — مخالف بهم صورت شام و بام
ز من وصف او و ازو غیبتم — زهی مزد خدمت زہے خدمتم
ز من شعر و او را همیں بر زباں — کزیں هرزه گوئی چه سودائے فلاں
ز من خامشی و ازو گفتگو — وزیں ماجراها سخن کو بگو
دریں مهر و کیں شد بسر چند سال — وزو کیں نه کم گشت در هیچ حال
یکے گفت یا من تو هم آدمی — کنی چوں نه با کیں ذمی همدمی
ترا هر قدر ها که او رنجه کرد — نه رنجانیش گر دریغ است و درد
بگفتم نرنجد اگر کسی از کسی — بود گفتگو اندریں جا بسی
ز روز ازل رفت فرماں چناں — که من ایں چنیں باشم و او آں چناں
بود طبع هر یک بفعل خودش — خدا داند انجام نیک و بدش
بهشت و جحیم آخر از بهر کیست — مآل خود و او ندانم که چیست

بهشت از کسے کو نرنجد ز کس بدیں نکته ختم این حدیث است و بس

حکایت

حسد بر سه نوع است معلوم کن گرت فهم تیز است مفهوم کن
یکی آنکه حاسد نخواهد چنان که احسان کند کس بکس در جهان
دوم آنکه گو باشدش مال بیش ز اهل کرم هیچ لطف و کرم
خوش است آنکه هرگز نه این هر سه را دهی جای یا خویش بل در سه را

باب پنجم در شعر و شاعری

حکایت

شهے شاعری را بجرمے سپرد بجلاد و هرگز غم او نخورد
زمانے کی جلاد تیغی کشید پر و رنگ از روئے شاعر پرید
بگفتش یکی این چه نامردیست بآں گرم خونے چه دل سردیست
چه شد آن سر قتل خواهیست به شعر ندانم چه بود است کیشیت به شعر
بگفتا تو گر مردے اے بوالهوس بیا و بجایم نشیں یک نفس
شه این نکته چوں از زبانش شنید بخندید و اندر کنارش کشید
ز جرمش گزشت و امانش بداد دگر نعمت بیکرانش بداد
خوش آں شاعر و خوشتر آں قدر دان که داند کنوں قدر ما شاعراں

باب ششم در راستی

حکایت

یکے را بخواب اندر آمد یکے که بیهوده بود از عدم مسلکے

بپرسیدش آیا چه حق با تو کرد   رسانیدت بجاں راحتی یا که درد
بگفتار مرا بر سر عدل داشت   وزاں عدل منت بجانم گزاشت
زمن کرد یعنی نخست ایں سوال   کہ ای من ترا داده فضل و کمال
ہمی یاد کردے مرا بے ریا   ودیا شکرم اوردی از دل بجا
باعمالِ خود دیدم آں گہ کہ من   ندیدیم یکے زاں دو بے مکروفن
باقرار آں لب کشودم دگر   سخن راندم از راستی سربسر
بآں راستی راست شد جملہ کار   ببخشود برمن خداوندگار
بمن داد از لطف خلد بریں   خدارا تو ہم راستی برگزیں

باب ہشتم در مذمت خست

حکایت

سخے تازه نخلیست راحت رساں   کہ اوصافش آید نہ اندر بیان
فدائے چناں نخل جانم بود   جزایں تاچه درد زبانم بود
کہ خوابند در سایہ اش دخیاں   بہ بینند در خواب باغ جناں
نشینند بر شاخہایش طیور   نشیمن کنند و بر آرند شور
کنند از دفور طرب کرمکاں   بسوراخہایش مکاں درمکاں
خورند آب گلہائے او صبح و شام   مگسہا و باشند بس شادکام
نباتات ہر گونہ دریائے او   دمند و در آناق رنگ و چه بو
پس ایں جملہ در ذات مرد سخیست   کے گر نہ باور کند دوزخیست

باب نہم در عشق

حکایت عبد اللہ مبارک

شنیدم کہ عبد اللہ محو دلق   کہ او را مبارک ہمی خواند خلق

بعہد شباب از زناں بابکی | کہ بود آں یکی خود بصد ہا یکے

بسے ہمچو من داشت دل بستگی | وزو حاصلش بود دل خستگی

شبے زیر دیوار او در رسید | خود او نیز از غرفہ سر برکشید

بہم ماند حرف و حکایت بسی | ز تمہلاے ہجراں شکایت بسی

کہ تو آں زماں رخ ز من تافتی | نہ اندازۂ عشق من یافتی

تو آگوہ و رزیدے از من حجاب | ندیدی کہ چوں بودہ ام در عذاب

ہر آئینہ از شام تا صبح ماند | ہمیں ذکر و ہر یک ہمیں قصہ خواند

کہ ناگاہ بانگ نماز سحر | ز مسجد بر آمد بذوق دگر

بدانست عبد اللہ عشق باز | سراپا نیاز و طلبگار ناز

کہ بانگ نماز عشا ہست ایں | دم خواب درویش مشاہست ایں

چو گردش نظر بود صادق سحر | ہمیداد از درد ہجراں خبر

بسے شد ملول و بسی شد حزیں | ز ناکامی خویش چیں بر جبیں

دراں حال آمد بگوشش ندا | کہ اے ماندہ از من ہمہ شب جدا

چہ کردی کہ کردی تلف وقت خویش | بعشق زنے اے نکوہیدہ کیش

گستی ز من ساختی باز نے | زنے مرد را در جحیم افگنے

تفاوت نہ کردی تو در نور و نار | کجا بندۂ و کو خداوندگار

ازیں حرف عبد اللہ غمزدہ | ز مرگ دل خویش ماتم زدہ

بخویش آمد و توبہ زاں عشق کرد | بعشق خدا گشت صحرا نورد

بکلی دراں عشق مشغول گشت | نہ از این و آں بلکہ از خود گذشت

حکایت

دو یار وفا پیشہ روزی بہم | کہ خوردی یاں روزانہ قسم

یکشتی پئے عبرہ جا داشتند | نظر بر تموج فرا داشتند

کہ ناگاہ آں کشتی از ہم شکست | دراں بحر و دلہا بصد غم شکست

فتادند در ورطهٔ آں ہر دو یار — پئے بُردن جاں نماند اختیار
دراں حال ملاح خود را فگند — بآب و شدش ایں وفا دلپسند
کہ آرد ازاں آناں یکی را بدرد — کشیدی ز دل آں یکی آہ سرد
گرستی و گفتی کہ ای دلپذیر — مرا کن رہا دیگرے را بگیر
غرض ہر دو گشتند آنجا غریق — وفا بود گوئی تو بحر عمیق

باب دہم در ذکر موت

حکایت

یکی بود خوش طبع و خوش اعتقاد — نکو خوی و خرم دل و پاک زاد
بجز خوش دلی ہیچ کارش نبود — تو گوئی غم اندر دیارش نبود
ہر آنکس کہ مُردی بتابوت دی — رسیدی و خوردی بصد ذوق می
دراں ذوق با خوشدلی ساختی — چہ خوش خوش مزامیر بنواختی.
دراں پس دم از وجد حالت زدی — دراں وجد و حالت برقص آمدی
غزلہا بخوش نغمگی می سرود — غم از خاطر ہر یکے می ربود
جز ایں تا چہ رانم سخن باز ازو — دراں سوز بودی بسے ساز ازو
قضا را جگر گوشہ اش نیز مرد — فلک نقش ہستی ز لوحش سترد
بدستور پیشیں ہم آمد فراز — بتابوت او ہم بداں برگ و ساز
ایاغی کشید و دماغی رساند — ایاغی دگر بر ایاغی رساند
ہماں نغمہ بود و ہماں سر خوشی — طرب بر طرب ہم خوشی بر خوشی
غزل میر و و قدح می کشید — دعائی نمود و ثنائی شنید
دف و چنگ و بربط ہیا ہمہ — سر و برگ شادی در آنجا ہمہ
بوجدش فتاد و جد صاحبدلان — دگر حالتش را چہ شرح و بیان
یکی رفت و پرسید از وی ایں سخن — با ہستگی کای فدای تو من

ازین مرگ حالِ تو چونست چون　　صبور است دل یا که خون است خون
بگفت ار چه این تیر کردست کار　　گذشته است از سینه بے اختیار
ولی نگذرم از طریق کهن　　بترسم که خندند مردم بمن
همان شرم دارد هنوزم برین　　وگرنه اجل را خودم در کمین
بلے این چنین تیر هر کس که خورد　　بیک دم دو صد بار بیش مرد

باب یازدهم در انتقام

حکایت

یکے جفت کنجشک در خانهٔ　　بسقف اندرون داشت کاشانهٔ
همی بگذرانید با کام دل　　همش قوت جسم و هم آرام دل
دران سقف بودی یکی مار هم　　عذابش درین دور بسیار کم
بلا جانور خوار هر دم گزاے　　پُر آشوب پُر زهر قهر خداے
چو کنجشک را جوجها بود زے　　و زو بچهٔ در وجود آمدے
بخوردی دل‌آزار خونخوار مار　　جفا پیشه ظالم ستم کار مار
دل از غصه کنجشک را سوختے　　بجهاں غم کشیدے جهاں سوختے
بهر جزو و کل داد چون حق تمیز　　بدین کار کرد آنچه کنجشک تیز
که یک شب فتیله یکے از چراغ　　بمنقار خود برده با صد فراغ
بکاشانهٔ مار بنهاد و خویش　　طریق امان باز بگرفت پیش
بیامے نشست و نظر بر کشود　　که بیند بخصمش ازو تا چه زود
بصاحب مکاں چون شد این اشتباه　　که تا گاه سقفش بسوزد چو کاه
ببالا شد و سقف از هم درید　　در آنجا همان مار خونخوار دید
که بر جان کنجشک کردی ستم　　بدل ساختے شکّرش را بسیم
سرش کوفت با چوب و کردش هلاک　　نشاندش بخون و فگندش بخاک

برآسود کنجشک از ظلم او　　بیامد بکاشانۂ خود فرد
غرض ظالم از ظلم خود پیشتر　　دہد جان بسختی رود در سقر
تو گر از سقر ترسی اے جان من　　مشو ظالم و ظلم را بیخ کن
تدیدے چساں ظلم می کرد مار　　بکنجشک و از دست کنجشک زار
بپاداش خود چوں سپس در رسید　　بتلخی چساں زہر کلفت چشید
خوش آنانکہ ترسند از انتقام　　نہ از انتقامند آگہ عوام

باب دوازدہم در ذکر مصنف

چہ خوش بود وقتیکہ من داشتم　　پدر بر سر خویشتن داشتم
مپرس اینکہ عالم چساں می گزشت　　نشاطم بدل ہر زماں می گزشت
گہ انگشت او در کف من ز ناز　　گہ آغوش او بہر من بود باز
گہے تنگ بکشیدنش در برم　　گہے دست مالیدنش بر سرم
گہ از بہر نیاں بستر دلکشم　　گہ افسانہا بہر خواب خوشم
گہ از باغ در خانہ آوردنم　　گہ از ذکر آدینہ خوش کردنم
گہے زانچہ خواندم بپرسیدنش　　گہے از تعجب بمن دیدنش
گہ آیا چہ ذہن رسا داشت است　　چنیں ذہن ہر کس کجا داشت است
شود روزی آن منتہی کانچناں　　نبود است از ہند تا اصفہاں
ز مادر بمن آن محبت کہ آہ　　پئے عمر و دولت دعا صبح گاہ
بہ چشمش چو ہر سال بالیدمے　　وزد کام جاں تا کجا بردمے
چہ پر مغز بادام و شیریں رطب　　چہ دلکش انار و نوائیں عنب
مہیا ہمہ تا چہا خوردمے　　وزد کام جاں تا کجا بردمے
در اندر ربا گوشم انداختے　　نہ در گوشم از پند پر ریختے
سیہ کردی از دودہ چشمم ہمی　　بدی در سیہ چشمیم عالمی

وزاں دو دہ خانی نہادے بدل کہ از چشم بد بودے در اماں
قباراست کردی ببالاے من نظر دوختے بر سراپاے من
بفرقم نہادے کلاہِ سمور ز پشیم گزشتی و دیدے ز دور
کہ آیا چساں آیم اندر نظر کنم خوں بد اندیش را چوں جگر
بگیسوے من شانہ یکسر زدے دل صد چو خود را بہم برزدے
ہمیشہ نہادی برو غازہ ام بہر حال دیدے تر و تازہ ام
زخواہر ہماں شفقت از حد زیاد دگر گفتن اینہم کہ عمر تو یاد
بمادر دعاگوئی من صبح و شام فدائی من و روئی من صبح و شام
برابر بجاں خواندیم ہر نفس غبار از رخ افشاندیم ہر نفس
ندانم چہ فہمیدی از ابر دیم کہ گفتی توئی قوت بازویم
غزل خواندمی پیش او چوں پدر گد گریستی و گفتی کہ فرداست فرد
دگر گفتی اے یوسفم در برآ نیم از حسودانت از درد آ
من آنم کہ گیرم ترا در پناہ روم افگنم دشمنت را بچاہ
زبیرا ہنت دیدہ ام روشن است ز یعقوب نے ایں حدیث از منست
توئی ایکہ جاں منت خواندہ اند کراچیز من ایں جانت خواندہ اند
فدائے تو من بلکہ خویش و تبار شوی شہرہ آخر بشہر و دیار
ترا زندہ دارد خدا تا ابد بتو صد مسیحا فدا تا ابد
پرستار ہا یک از بہر کار تہیا کہ گوئیم کراچی بیار
بدلجوئیم ہر زماں ہر یکے بہ پہلو یکے بود و بر سر یکے
پئے ہر چہ دل خواستی یا زباں بجنبیدیم لب کہ گشتی ہماں
دعا گوئے صحت طلبگار خیر نہ خویش ایں چنیں مشفقم بلکہ غیر
دریں جا چہ آید خوشم ایں زباں دو مصرع ز سعدی شیریں زباں
اگر بر وجودم نشستی مگس پریشاں شدی خاطر چند کس

گرفتی بتم گر بفرض اندکے — نبردی زغم جان از ینها یکے
شدے روز یم گو نہ گر درد سر — سر کس ببالیس نماندے دگر
غرض چوں زماں منقلب ہر دم است — پس از بیکراں عیش بے حد غم است
از ینہا یکے بر سر من نماند — بجز شور اندر سر من نماند
کنوں بے کسی ہست و من وائے من — دگر طالع پست و من وائے من
ہمہ خواب بود آنچہ را دیدمے — چہ خوش بودے ار گور گر دیدمے
پدر از جہاں رفت و مادر نماند — ز خواہر چہ پرسی برادر نماند
منم ایں زماں آں فرد ماندہ کس — کہ بر وی تو آں گریہ ہا گر دو بس
الٰہی کسے زار چوں من مباد — اجل را طلبگار چوں من مباد
نمیزاد اے کاش مادر مرا — چساں بگزرد بے برادر مرا
بہر حال چوں مردن و رفتن است — غم این و آں خوردن و رفتن است
بخود گفتم آں جا کہ رفتند شاں — تو ہم می روی قصہ دیگر مخواں
ز رفتن بگوی دگن ایں راہ طے — کہ جمشید گی ماند و کاؤس کے
کنی اینکہ از رفتگاں گفتگو — کنند از پس رفتنت ہم ز تو
دمے عبرتے گیر از رفتگاں — تو ہم بودہ تفتہ از رفتگاں

حکایت

بفضل خدائے زمین و زماں — من تفتہ جان و من خستہ تن
ہراں کار کا غاز او ساختم — با نجام آں نیز پرداختم
دو دیواں نوشتم جز ایں مثنوی — دگر نسخہ ہا ہم بطرز نوی
کسے گفت تحسیں کسے آفریں — من از جاں فدائی جہان آفریں
دے بعد انجام آں جملہ کار — گر ستم بر احوال خود زار زار
کہ آیا چہ آغاز دل خوش کن آں — دگر اینچہ انجام سوہان جاں
رسیدم نہ بر خاص مطلب ہنوز — قیامت شد و شد شب ان روز

دراصل آمدن ہست آغاز کس ‏ ‏ دگر از جہاں رفتن انجام و بس
پس آنگو نہ انجام پیش نظر ‏ ‏ ندارد چرا چوں من بے خبر
نہ چوں دل گمارد بر انجام اصل ‏ ‏ ز عیبش رسد تا چہ پیغام وصل
روم کتر تجالت بجاں آمدم ‏ ‏ عیاں تر روم گر نہاں آمدم
الہٰی کسے سد راہم مباد ‏ ‏ بجز رفتن از ہیچ خواہم مباد

باب سیز دہم در خاتمۂ کتاب

چو آمد کنوں جملہ کار تو راست ‏ ‏ دعا کن دعا گفتہ کہ وقت دعا است
جز ایں تا چہ دیگر سخن گویمت ‏ ‏ خدا را ہماں کن کہ من گویمت
دعا آدمی را رہاند ز بند ‏ ‏ رہاند ز بند و کند بہرہ مند
دعا کن و زاں پس سپاس خدائے ‏ ‏ و زاں ہم چوں فارغ شوی در خود آئے
ضرور است دانستن قدر خویش ‏ ‏ ترا و مرا اے سر افگندہ پیش
تو دانی دمن ہر چہ داریم قدر ‏ ‏ نو خوار و من ابتر چہ داریم قدر
دگر از من و تو چہ باشد سخن ‏ ‏ منم بے خبر چوں تو و تو چو من
من و تو یکے برگ از آں باغ و راغ ‏ ‏ کہ عقل اندراں باغ و راغ است داغ
من و تو یکے ذرّہ دیگر چہ حال ‏ ‏ ہماں خاک راہ و ہماں پائمال
ہمانست گو نیست را کرد ہست ‏ ‏ ترا و مرا دل عطا کرد و دست
ہمانست گو آفرید این و آن ‏ ‏ ترا و مرا جسم بخشید و جان
ہمانست گو زد سخن را بقند ‏ ‏ ترا و مرا داد فکر بلند
ہمانست گو ساخت نطق و بیاں ‏ ‏ ترا و مرا داد کام و زباں
ہمانست گو ہند را در سخن ‏ ‏ کند پارس و خت گزاد و بمن
ہمانست گو شاعرے آورد ‏ ‏ دریں جا و شعرش بہر جا برد
کند شہرۂ شہر پایش چو ماہ ‏ ‏ بالبست گا ہے و بدریت گاہ

دہد لفظ را معنی کو دہد   تنِ مُردہ را جان و نیکو. دہد
خودش ہرچہ بخشند ز فضل و ہنر   رساند خودش پیش اہل نظر
کند با عشش رحمتِ خویش را   کہ رحمتِ نداند کم و بیش را
پس از فیض دادن بشاعر دہد   نشاطیکہ چوں من ز جا بر جہد
دگر بے نیازش ز ہر کس کند   ہم اینگونہ نازش دگر کس کند
پس اینہا کہ گفتم ترا کارا دست   عبث سفلہ نازاں بنام نکوست
ہمانست ہر فعل را فاعلے   و لے باید این جا و صاحب دلے
کجا ہر دنی و کجا ایں تمیز   کہ داند چرا خوارم و چوں عزیز
عزیزی خواری بہم دل نشیں   ہم از دستش آں و ہم از دستش ایں
اگرچہ سخنہا بسے گفتنی است   نگفت انچہ ہرگز کسے گفتنی است
ہنوزم زند جوشہا بحر طبع   خوشا در معنی خوشا بحر طبع
ہنوزم نیامد بلب اندکے   کجا آں ہزار و کجا ایں یکے
مضامین ہجوم آورند آں قدر   کہ تاید بجز در کتاب دگر
و لے دید باید کہ عمر است چند   کہ بے عمر ایں خود نیاید بہ بند

الٰہی دمے چند دیگر زیم
دگرنہ ہنوز انچہ دانی نیم

انتخاب از تضمینِ گلستاں

خدایا شد نہاں و آشکارا — نگویم از چہ منت مرا خدارا
ازاں در طاعتش از خود رمیدم — کہ طاعت موجبِ قربت شنیدم
غم او گرچہ روزی موبمو ہست — مزید نعمت اندر شکر او ہست
نباشد لحظۂ بے غم حیاتم — حیاتم را فدا ہر لحظہ ذاتم
دمے کاندر رود ہمدم ہمانست — چو برمی آید آہِ خونچکانست
غرض موجود در یک دم دو نعمت — چہ خوش یک آدم و باہم دو نعمت
چہ گویم تا چہ احساں کرد بامن — توانم شرح آن احسان کجا من
بہ بیں چون خلعتِ ہستی بمن داد — سخن زان بعد ایں لطفِ سخن داد
بایں لطفِ سخن خواہم جناں ہم — چو ایم داد خواہد داد آں ہم

نعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

پس از حمد خدا نعت محمد — کہ سازد کار ہا نعت محمد
محمد آنکہ خوانند آفتابش — فلک رخشِ ست و ماہ نور کابش
محمد آنکہ وصافش ملائک — خود او جان و تن صافش ملائک
محمد آنکہ باشد سر بسر نور — ز مشرق تا بمغرب سایہ زو دور
محمد کان بود عاشق خدایش — خدارا تا چہ خواہد بود دایش
جز ایں دیگر چہ آیت ہا بشانش — کلام اللہ سر زد از زبانش
شفیع ما ہماں شافع دل افروز — نماید آنچہ فردا دانم امروز

بہشت از من کزیں پس عہد کردم — بہشتی روضہ اش را گرد گردم
غرض گفتن نیارم ہر چہ بود ست — کنوں بر آل و اصحابش درود است

سبب تالیف

ز فرزندانم آں فرزند کوچک — کہ پیتمبر ہمی خواند لیش ہر یک
چہ پیتمبر درامر خیر سامے — چہارم مصرعے بود از رباعے
چہ پیتمبر عزیز مصر جانہا — زلیخاے متاعش کاروانہا
چہ پیتمبر چراغ خانۂ من — دل من جان من جانانۂ من
چہ پیتمبر بمن بستان معنی — عیان از صورت او شان معنی
چہ پیتمبر بمن ہر لحظہ ہمپاے — اگر من رفتہ جاے او نہ بیر جاے
چہ پیتمبر رواے تا زیر دوش — مرا پیوستہ ہمچوں دل در آغوش
چہ پیتمبر فروغ دیدۂ من — فراغ خاطر ژولیدۂ من
چہ پیتمبر انیسم در شب تار — اگر من خفتہ او چوں شمع بیدار
چہ پیتمبر دواے درد ہایم — اگر من مضطر او تسکین فزایم
چہ پیتمبر بہر حال الفت آئیں — اگر من رنجہ خاطر او غم آئیں
چہ پیتمبر بدل از مہر جاگیر — بطفلی در خرد افزوں تر از پیر
چہ پیتمبر سر نیکو نہادال — ادا فہم و ادا سنج و ادا دال
چہ پیتمبر بہ نیکی سخت کوشی — سخن نا گفتہ فہمی تیز ہوشی
چہ پیتمبر باں گلگوں قبائے — برو صادق اداے میرزائے
چہ پیتمبر فدایش جان تفتہ — نثار تفتہ و قربان تفتہ
چہ پیتمبر فصیح و خوش بیان نیز — گلستاں بر زبان و بوستاں نیز
چہ پیتمبر ز من ترساں ز حد بیش — خجل از شوخی نا کردۂ خویش
چہ پیتمبر سزای سر بلندی — عیاں از جبہ اش اقبال مندی
چہ پیتمبر بہار باغ ندرت — سمن بر لالہ رو شمشاد قامت

چه پیتمبر بهر شب ماه عیدم — مرادم مطلبم کامم امیدم

جهان را گر دیده رد و بمن داد — غمی کز دست آن غم بی‌سخن داد

مرا با خویش سوی آن جهان برد — عیانست انچه میگویم نهان برد

چو بازم که رفتم در رکابش — در نگم گشت قربان بتابش

تمیزی گر کند کس در کم و بیش — من از وی رفته ام صد ساله ره پیش

هنوزش بود جان بر لب که مردم — سخن بودش نهان بر لب که مردم

بدین رمز نهان باید رسیدن — بمرگ من فغان باید کشیدن

تکلف شاعری را نیست زنهار — نه یک بار از جهانم رفته صد بار

زشعر و شعرخوانی تا چه حرفست — زکام و کامرانی تا چه حرفست

وجود این و آن لا می‌توان یافت — فراق جسم و جان را کی توان یافت

بسی دیدی اگر چه جسم بیجان — مرا هم بین که من خود بوده ام آن

برای نام گوی یک طلسم — طلسم را کشا بر سی چه اسم

حزینی تفته جانی مشت خاکی — غنیمی بیدلی اندوهناکی

ز جانی سیری غم فرزند خواری — غریبی بیکسی بد روزگاری

چه گویم تا کجا ضعفم رسانید — رسد گر گویمت نتوان مرا دید

کنون بر لب نه حرفی دیگر آید — دگر آید همان پیتمبر آید

تو گوئی برقی بود آنکو مرا سوخت — نه خود را بر سر هر کو مرا سوخت

دگر زان برق سوزان هیچ اثری — بجز خاکسترم در رهگذر نی

مرا هر کس که بیند سوزد از درد — که بر خس طرفه بیداد آتشی کرد

کجا این خس کجا بیداد آتش — فغان از آب و خاک و باد آتش

بظاهر تفته ام اما همان خاک — کیم ای بر سر من یک جهان خاک

مرا صورت نماند و معنیم من — ازین بیش انچه بودم آن غم من

همان بستر همان زاری همان درد — مریضی چون نزید با یک جهان درد

چو من مشتاق مرگ این دم دگر کیست — ز کلفت بر طرف کو من کجا زیست

خیالے گشته ام ز انسان که هر کس — بخواب اندر مرا بیند از ین پس

به بیداری به چه آیم در نظرها — که رفت از خفتنم هر سو خبرها

منم در زندگیها خفته در گور — غم فرزند جائے شمع بر گور

کنون حالم نه آن کاید به گفتن — بگفتن گو منه گوش شنفتن

من واز ناتوانیها ایم این بس — فرو ریزم گر انگشتم زند کس

گرم یک قطره از بحر بریدن — ز مژگانم دهیاے چکیدن

ورم یک ناله از بیتابی دل — جهم از لب کنم بر عرش منزل

چراغ صبحگاهی بوده ام من — بود روشن که راهی بوده ام من

نیاید کس مرا زین پس بنزدے — من و بعد از دمی راهی وعزمے

غرض روتے بحال کنز ماتم او — چنینم وین چنین دارم غم او

دم درس گلستان بر زبان داشت — که رحمت اے پدر برمن توان داشت

نه مقصود من از درسم همین ست — مراد من اگر یابی همین ست

کهر خود درین فن صرف کردی — دو صد دل خون ببیک یک حرف کردی

نه بخشیدی از ین دولت مرا هیچ — بمیرم چون که شد قسمت مرا هیچ

چو او مرد و بیادم آمد آن حرف — بجانم زخمهاے تو زد آن حرف

ز خود رفتم چنان کا یولائے وائے — دلم آمد بجان کا یولے ایولے

بخود گفتم چه دیگر ناتوان کرد — بنامش نسخهٔ انشا توان کرد

بایں تقریب تا نامش بماند — مے مقصود در جامش بماند

اگرچه او بلاکم کرد زین سان — مسیحاے کنم با او من از جان

وقائع او بمن هر چند معلوم — کنم موجود آنکو گشت معدوم

روم تا نامش گزارم بر زبانها — گزارم یعنی از وے داستانها

که داند هر یک آخر هست از نیست — که پیغمبر که بود و این فغان چیست

جز این در خاطرم نگذشت باری کزین خوشتر نه هرگز هست کاری

چو هر بیت گلستان بر زبانهاست فدای لفظ و معنیهاش جانهاست

به تضمین آرمش نوعی که تحسین کند خود سعدیم کاین است تضمین

بایں پیری زنم حرفی چنان خویش کزو گردد شکلِ هر بیت خوش

مضامینِ نوی آرم بد انسان که گردد مشکلِ هر بیت آسان

کند فردوسی از شفقت دعایم بود در گلشنِ فردوس جایم

نظامی گویدم وقتِ تو خوش باد دگر شد خانهٔ نظم از تو آباد

بدست آرم ز خسرو خسرو بها بہ بخشم کہنگی ہا را نو بہا

ز جامی جامے از احسنت گیرم نگنجد غیر مستی در ضمیرم

نهد بر لب ثنائے من ثنائے کند هر شب ثنائے من ثنائے

به پیشم ناز دارد بر نکته رائے بمیرد عرفی اندر نوجوانے

همی داند نظیر خود نظیری همی خواند نظیر خود نظیری

شود شاد از ظهور من ظهوری کند یاد از ظهور من ظهوری

اسیر اندر فلک سیرے اسیرم شود چندانکه ناید در ضمیرم

کشم اندر ادا بندی به بندش ترا و دبستی از طبع بلندش

اگر خواهد که بر من غالب آید خلل اندر دماغِ طالب آید

حزین گر داندم نافهم و نارس فتد از لاهجان اندر بنارس

بود غربت نه آن آفت که گویم صد آفت به که یک غربت چه گویم

در از غالب سخن راندن توانی من و مغلوبی و عجز آنکه دانی

به پیشِ هر یکے دارم بسے قدر ولے من آستان غالب بود صدر

بتائیدش کنم کارے که بینی نمایم طرفه گلزارے که بینی

هر آن معنی که در لفظ از من آید نه معنی جان پاک اندر تن آید

بهر مصرع که بیتے در رسانم بتابش بر فلک یکسر رسانم

فصاحت ہر کرا باید فصاحت   بلاغت ہر کجا شاید بلاغت
نہم پیش نظر انداز سعدی   کنم پرواز بر انداز سعدی
چہ دور از فیض عالی مصرع او   کہ تابد مصرعم از کہکشاں رو
سخن رانم ز پیغمبر درانجا   دُر افشانم ز پیغمبر درانجا
بگریم در سخن افزایم آبے   نویسم بعد ازاں نادر کتابے
شود تازندہ پیغمبر دگر بار   دہد داد مسیحائیم ہر بار
ادا گردد حق او نیز از من   دگر بر داو کدامیں چیز از من
کنوں یاد از کفن می آرم و بس   ارس از دیدہائی یارم و بس
دریں رہ ہمتم چوں بود کامل   رسیدم در دمے آخر بمنزل
تمام ایں نسخہ را کردم بہر حال   مضامین نو آوردم بہر حال
نوشتم ہر چہ بپسندید ہر یک   دگر از چشم حق بیں دید ہر یک
خصوصًا میرزائے نکتہ زائے   چمن طبعے گلے رنگین ادائے
بستان سخن را طرفہ بشرے   اسد یعنی بہر میداں دلیرے
قصائد زو چناں کش دید باید   گل از باغ غزلہا چید باید
رباعی آنکہ شورش چار سو ہست   دگر باور نداری رو بہ او ہست
مپرس از قطعہ اش گردد زباں قطع   اگر گویم بہشت آمد بآں قطع
ز نثر او ظہوری را جگر خوں   ابوالفضل ست اندر خاک مدفوں
دگر انداز اخلاقش کہ گوید   ہماں داند کہ در راہش بپوید
ہر آنچہ از وے بود قربان یاراں   بجان وے دعائے میگساراں
دگر از سیم و زر کا صلا ندارد   دگر دارد چو ابر از کیسہ بارد
نباشد صرفہ اش ہرگز در اسراف   اگرچہ حرفہا باشد بر اسراف
سخن اینست و بس من ہیچ بنوم   بر آں نکتہ رس من ہیچ بنوم
بود تا میرزا غالب ز من شاد   خراب من سراسر باشد آباد

فدائے میرزا غالب دل وجاں — گدائے میرزا غالب دل وجاں
چہ غالب ہم نوائے قیصر وجم — چہ غالب میرزائے قیصر وجم
باہل فارس غالب غالب ما — بہ از عرفی و طالب غالب ما
دُرے از دُرج نوراں چشم بد دور — مگو از سایہ کاینجا سر بسر نور
دگر از بند گفتن روسیاہی ست — گواہِ تفتہ از مہ تا بماہی ست
چہ گویم تا چہ رحمت کرد با من — وگرنہ کو جناب او کجا من
رسد تا زش چہا بر فرقدانم — رسانید از زمیں بر آسمانم
بود ہر ذرّہ او آفتابے — درش را خواندہ ام روشن کتابے
اگر صد دفتر از مدحش نگارم — یکے باشد یکے از صد ہزارم
الٰہی بر سرِ من سایہ اش باد — زہر پایہ فزوں تر پایہ اش باد
بماند تا ابد باقر علی خاں — کہ از پورانِ او پور خوش ست آں
کند عمر خضر حق روزی تو — بود تاخیر خیر اندوزی او
چساں در شکر گویانش در آیم — کجا از عہدۂ شکرش بر آیم
غرض در ہفت یا در ہشت ہفتہ — رقم ایں نسخہ زد بے مایہ تفتہ

تاریخِ اتمام و نام کتاب

چو یا شد معنی ایوائے افسوس — نہ زیبد اندریں جا جائے افسوس
شود تاریخ ختمش لے نکو رائے — ز تضمین گر بر آرے لفظ ایوائے

۱۲۷۲ھ

آغاز تضمین

تنہا نہ من و عذر کہ شکرش — کے از من کو نہ نظر آید
در وہم و گمانِ کہ بگنجد — از دست و زبانِ کہ بر آید

آں کز پئے خوشنودی عاصی   عفوش ز گنہ پیشتر آید
تو خود بدہ انصاف کہ باشد   کز عہدۂ شکرش بدر آید

باب اوّل

حکایت بادشاہ رنجور

بشب تو آئی و ابر آید و دگر ہمہ دوست   بمن تو باشی دمی باشد و دگر ہمہ چیز
دریں ہوس بگذشت آہ وقت عیش و نشاط   دریں امید بسر شد دریغ عمر عزیز
نیامد او ز درد آمد آہ جاں بلبم   دگر کجا بلبم آہ جا نگداز آید
ہمیشہ در دلم ایں وائے ایں تمنا ماند   کہ آنچہ در دلم ست از درم فراز آید
دلم ز بخت سیاہم بحیرت و من ہم   خموش باہم و گویم بلے چہ فائدہ زاں
بجود نبودم و او زلف عنبریں بکشاد   امید بستہ بر آید و لے چہ فائدہ زاں

گذشت دلبر و گوید دلم شو نومید   بعید نیست کہ عمر گذشتہ باز آید
بمصلحت شنوم ایں دروغ از و ورنہ   امید نیست کہ عمر گذشتہ باز آید

دور آخر رسید شکر خدا   ساقیا مژدۂ بمستِ اجل
یعنی اکنوں چہ دیر در کوچ نست   کوس رحلت بکوفت دستِ اجل

حسرت نظارہ بعد ازیں مزنید   قصۂ گریہ مختصر بکنید
عاقبت خاک می شود سر تیز   اے دو چشم و داغ سر بکنید
غیر ازیں دیگر ایں زماں چہ کنید   یاد عا یا بکار رہا نیرد
کار از دست میرود اکنوں   اے کف دست و ساعد و بازو

هرچه کردید پیش ازیں کردید — بعد ازیں ایں خوش ست اگر بکنید
یعنی از یک دگر بود رنجے — همه تو دیع یک دگر بکنید

دشمنی ها بکام خود کردم — منتمندی نداد فرصت تام
رحمت اکنوں روا وگر بر کیست — بر من مستمند دشمن کام

دشمناں نیستند قابل رحم — رحم بر من کنید اگر بکنید
چند بے یک نظر من وایں حال — آخر اے دوستاں نظر بکنید
کیست نا کامی مرا مانند — کیست نادانی مرا ثانی
عمرم آمد بسر بنا کامی — روزگارم بشد بنادانی
میکنند عاقل از بلا حذری — عاقلاں قصه مختصر بکنید
یعنی آں طفل بد بلاست ازو — من نکردم شما حذر بکنید

حکایت هرمز

ترا نفقة خوانند حکمت پناه — کند کار بے حکمتی کے حکیم
شنیدم که نترسد ز تو خصم تو — ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم
مکن تکیه بر قول او اعتماد — که خصمت هماتست بی نام وننگ
اگر با تو صد بر آے بصلح — وگر با چنو صد برائے بجنگ

حکایت درویشی مستجاب الدعوات

نه تو مهرے نه ذره من هرگز — نه تو عرشے نه من زمیں زنهار
تو زبر دست و زیر دست منم — اے زبر دست زیر دست آزار
لے بیئی طبع تو بے مثل — داتش خشم تو جهنم وار
مه دنیا چند باشد ایں مطبخ — گرم تا کے بماند ایں بازار

گویدت چند غنچهٔ دل چو منے　　عقده نکشایدت جهاندارے
تو نیائی اگر بکار جہاں　　بچہ کار آیدت جهاندارے
ہر غمے کز تو من خورم بارے　　خوردنت بہ کہ مردم آزارے
ہمہ مردند مردم از آزار　　مردنت بہ کہ مردم آزارے

حکایت سیاه گوش

ازیں خود چیست لطف مذہب او　　کہ در ہر حال گبر آتش فروزد
ہماں خام ست ہمچوں مذہب خویش　　اگر صد سال گبر آتش فروزد
مرا ایں آتش خشم ست وائے بخیر　　تو پرسی کس چساں آتش فروزد
سمندر تا دو صد سال وچزا وکس　　اگر یک دم در و افتد بسوزد

رباعی

ہر چند بنعش ما بود تازه بہار　　از آمدن تو اے سراپا گلزار
ما از سر آرزو گذشتیم و ہوس　　تو بر سر قدر خویشتن باش وقار

رباعی

گر غیر ببازی و ظرافت شده خوار　　اے تفتہ بیا ترا ایں ہر دو چہ کار
غیرست ندیم و خواری غیریاں　　بازی و ظرافت بندیمان بگذار

حکایت یکے از دقیقان

دل غم ہمہ گفت وکس ندانست کہ کیست　　رسوا شده مفت وکس ندانست کہ کیست
بس نالہ کشید وکس نپرسید چہ شد　　بس گرسنہ خفت وکس ندانست کہ کیست

رباعی

از حالت تفتہ ما چہ گوئیم کہ چیست　　صد مرتبہ مرگ بہ ازیں بدتر زیست
تنہا نہ ہمیں دلش بجاں آمد و مرد　　بس جاں بلب آمد کہ برو کس نگریست

رباعی

باب دوم

حکایت دو بزرگاں

چہ بگویم دراں چھا یابے — چہ نویسم دریں چھا بینی
ہر کجا خبر بر ملا یابے — ہر کرا جامہ پارسا بینی

نقد رنداست گو بباطن لیک — تو زکف رسم ظاہری مگذار
یا خدا گیر و صبح خیز شمر — پارساداں و نیک مرد انگار

اے کہ گفتی چہ گفتنیش از من — من خموشم دگر بیانش چیست
الغرض حرف مدعی مشنو — گر ندانی کہ درنہانش چیست

ولہ

من اگر رند پارسایاں را — بمن رند ابلہانہ چہ کار
اے کہ گوی توے خوری پنہاں — محتسب را درونِ خانہ چہ کار

حکایت عبد القادر گیلانی

اے کہ پرسی بعمر خویش ترا — چہ مرادست ہرزہ می پویم
ہرچہ یا بادمی تواں گفتن — روی بر خاک عجز می گویم

اے کہ پرسی کہ از گلستانم — بتو بوئے وداد می آید
خاک در چشم دشمن من و تو — ہر سحر گہ کہ بادمی آید

چہ سخن گفتم و چہ شد اکنوں — بے زبانم چہ غیر ازیں سخنم
[illegible] — [illegible] فراشت نکنم

نیست ترک ادب کہ ایں یک حرف — بر لبم از اتحاد می آید
اے کہ پرسی خدای تو کہ بود — ہیچت از بندہ یاد می آید

یک قطعہ بہ تضمین استعانت

قدم زد زاہدے با مردم دہ — دگر گویم چہ حال آں رنجہ را
نمی بینی کہ گاوے در علف زار — بیالاید ہمہ گاوان دہ را

نہ تنہا غنم صبح ناگاہ شب — دل من تراشیدہ در مجلسے
بصد رنج افتادہ چندیں جلیس — بیک ناتراشیدہ در مجلسے

اندیں کز جہالت زند حرف سخت — و زیں کز فضولیست خنداں لبے
بود خاطر اہل دل بس ملول — برنجد دل ہوشمنداں بسے
بپوئیم بباغ و بجوئیم سراغ — بگوشم بعیش و بنوشم شراب
اگر باغ خالی نہ گردد ز گل — اگر برکہ پُر کنند از گلاب
چہ خوش صبح من بود دم و چند تن — بحوضے کہ بود آب و ے خود گلاب
چو بخبر آمد ایں گفتم و تفت زدم — سگے در وے افتد کند منجلاب

دو قطعہ بہ تضمین استعانت

نکوی بمی اے ساقی ایں زماں کہ مدام — نکوی تو بہر بزم مے شود مذکور
نماند حاتم طائے ولیک تا باید — بماند نام بلندش بہ نیکوی مشہور

ولہ

چو ہست حسن تو مالی زکوۃ آں بوسیست — دگر چہ گویمت اے نکتہ سنج اہل شعور
زکوٰۃ مال بدر کن کہ فضلۂ رز را — چو باغباں ببرد بیشتر دہد انگور

باب سوم

حکایت حاتم طائی

نقد گو بی عمل از عمری نیست — نان ہماں از عمل خویش خورد
آری اصلا نخورد طعنہ زکس — ہر کہ نان از عمل خویش خورد
اے خوش آنکس کہ گر افتد در دام — میرود نام رہائے نبرد
بزم چوں ز دل خود منت — منت حاتم طائے نبرد

حکایت موسیٰ علیہ السلام درویشے را دید

اے کہ فرمائی فلاں یعنی عدو — کار ہا کردی اگر زر داشتی
ام گنجشک از جہاں عنقا شدے — گربہ مسکیں اگر پر داشتی
قصد ہر خرد و کلاں صیدائے ہما — ہر گہ آں شوخ ستم گر داشتی
خالی از باز آشیانہا ساختی — تخم گنجشک از جہاں برداشتی

ولہٗ

ایں کہ اکنوں در بر ہر سفلہ است — شد دو روزی چوں علم افراشتی
صد جماعت را بیک دیگر زدے — ہیچ کس را گر د خود نگذاشتی

ولہٗ

لاغرش کرد ایں چنیں ماہ صیام — ورنہ زاہد فتنہ ہا برداشتی
رفتی از جائے و بشر آو یختی — ایں دو شاخ گاو اگر خر داشتی

رباعیات

گیرم کہ جہانے از تو رحمت یابد — گیرم خود حاتم از تو ہمت یابد
ساز ے بعد و دایں ندانی چہ کند — عاجز باشد چو دست قدرت یابد

ولہٗ

از نیک بے تفاوت آمد تا بد — بد آنکہ چو زور گیرد و زر یابد

بنشیند و فکر جستن خلق کند　　بر خیزد و دست عاجزاں بر تابد

ولہ

ہیچ نگیرد ز فلاطون عیار　　ہیچ نبود دست ارسطو بمرتش

اہل ہنر در را شمرد سفلہ　　سفلہ چو جاہ آمد و سیم و زرش

عشق نہ بینم بسر و روی او　　درد دینا بسخن اندرش

غیر کجا در دسر او را کہما　　سیلے خواہد بعزت سرش

نفقہ پسند حکما می بود　　من ز تو این راز نخواہم نہفت

غیرتم اصلا مطلب از فلک　　آں نشنیدی کہ فلاطوں چہ گفت

ولہ

جانورے را کہ تمناست زیست　　چارہ نبود دست جزایں دیگرش

مار ہماں بہ کہ نیاید بروں　　مور ہماں بہ کہ نباشد پرش

باب چہارم

نہ من نہ تفتہ ہمانست بے سخن کیں تو ز　　بہ پیش آنکہ محبت ہنر بزرگتر عیسی است

خوش ست گر نمائی کلام من بعد　　ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبی است

ولہ

بعکس می نگرم جملہ فہم ور لے امروز　　ندانم ایں چہ زمان است وایں چہ کار است

زراست تفتہ ونیز دیک حاسداں ہمہ کس　　گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است

اے کہ فرمایم چہ پر نور است　　می تواں دید روز چشمۂ ہور

پرتو روی یار ما بود است　　نور گیتی فروز چشمۂ ہور

دست انصاف کاشکے یک شب　　خاک باشد بچشم موشک کور

زانکہ خورشید با چناں خوبی　　زشت باشد بچشم موشک کور

حکایت ناخوش آوازی

از حرم آئی و پلید آئی — بے وضو خوانی و غلط خوانی
شیخ گو حافظے خدا حافظ — گر تو قرآں بدیں نمط خوانی

تو نہ کافر نہ مؤمنے یعنی — شوخ و بیباک گر بدینسانی
بدہی آبروے کفر بباد — ببری رونق مسلمانی

باب پنجم

یک قطعہ بہ تضمین کے استعانت

تفتہ جز گر دغم نباید رُفت — تفتہ جز در لحد نباید خُفت
آں شنیدی کہ شاہدے بہ نہفت — با دل از دست دادہ می گفت
تا کجا پر سمت کہ منظورت — تا کجا قدرِ خویشتن باشد
قدر کس زینہار نشناسی — تا ترا قدرِ خویشتن باشد
اے کہ گوئی زِ ذرہ کم دانم — تو نیا گو ہزار من باشد
در نگاہت چہ رتبہ دارم من — پیش چشمت چہ قدرِ من باشد

رُباعیات

اینست کہ با عشوہ و ناز آمد پیش — انیست کہ با زلفِ دراز آمد پیش
تا باز چہ پیش آیدم از بخت سعید — آنکس کہ مرا بکشت دیاز آمد پیش

شوخی کہ حذر کند زِ بر گشتۂ خویش — بیند نہ دمی زِ دود در کشتۂ خویش
آ در بگور تفتہ، شمعے از ناز — ما ناکہ دلش بسوخت بر کشتۂ خویش

بغیر از عشق دستان نواے شیخ — بہ پیش ما چہ حاصل گر بخوانی

نحو انے حرفے ار از عشق ہیچ است　　اگر خود ہفت سبع از بر بخوانی

سبقی از عشق اگر خوانی کہ گوید　　تو اے مفتی الف باتا ندانی
دم تکرار راو نون و جیمش　　چو ہم شفتی الف باتا ندانی

من و تو یکے و ہرگز ہمی و تو نیست فرقی　　ز دوئی مگو کے ایں جا ز دوئی سخن بماند
ستم است با ظہورت ز ظہور من سختہا　　عجب ست با وجودت کہ وجود من بماند
دم عذر مستی تو من و شکوۂ تو پنہاں　　چہ سخن بود کہ پیشت بزبان من بماند
سختی است اینکہ ماند بزبان بغیر درنہ　　تو بگفتن اندر آئے و مرا سخن بماند

حکایت یکے راز تے صاحب جمال درگذشت

سادہ رو تا کہ ماند ماند اکنوں　　عاشقاں را باو چہ کار بماند
جبہت کو چید حسن و آمد خط　　گل بتاراج رفت و خار بماند
سیہ تاز و غمزہ ہم برگشت　　بعد ازینش چہ اختیار بماند
داشت گنجے بزلف یعنی دل　　گنج بر داشتند و مار بماند
اے کہ گوئی بیا ز ما آموز　　گل و ریحان وار غواں دیدن
بہ ز آموختن چنیں پیشم　　دیدہ بر تارک ستاں دیدن
دل بہ تیغ حرامیاں دادن　　دیدہ بر تیر رہزناں دیدن
بہتر از عیب دوستاں جستن　　خوشتر از روے دشمناں دیدن
دشمنند ایں برادر و فرزند　　عالمی ہست عالم تجرید
بہر یک دوست کش خدا نام است　　واجب است از ہزار دوست برید
دوستم گفتہ من ترا از دل　　ہرزہ گر دیدنت نباید دید
گویمت نفس خویشتن را کش　　تا یکے دشمنت نباید دید

باب ششم

حکایت با طائفہ دانشمندان

بتا کا میم شد پسر ہرچہ بود — کنوں مردہ ام عمر کو من کدام
دمے بود از عمر و ایں حمق بیں — دمے چند گفتم برآرم بکام

ولہ

رسیدم دریں منزل از راہ دور — ز بسیار پیش و ز بسیار پس
نفس راست کردم درایں جادے — کہ ناگاہ بگرفت راہِ نفس
زہے خضر و عیسی کہ باشد یکے — دل عمر و دیگر بود جان عمر
مرا جاں ندادند بیش از دمے — دریغا کہ بر خوانِ الوانِ عمر

ولہ

بچھا بود نعمت بریں خوان و باز — چہار اند مارا فلک چوں مگس
دمے چند ماندیم و گفتند خیز — دمے چند خوردیم و گفتند بس

ولہ

ہنوز غصہ ز صد یک نخوردہ شبِ ہجر — ہنوز نالۂ ہجراں نکردہ تقصے
ہنوز پا چو خودی دل ندادہ بعضی — ندیدہ کہ چہ سختی رسد بیان کسے

ولہ

ہزار رنج بہ پیرے وزاں ہزار یکیست — پس اینکہ گویدت اے نوجواں سخندانی
چہ ژالہ ہا کہ نمی اوفتد ز چشم کسے — کہ از دہانش پدر می کنند دندانی

ولہ

تو پرسی اے کہ زخوش خلقیم کہ در شبِ وصل — کدام از ہمہ ساعات خصم جاں ساعت
بر تو باشی و دل کامجوی و گردد صبح — قیاس کن کہ چہ حالت بود دراں ساعت

ولہ

پرس اینکہ تو پری باں شکیب وسکوں | چہ رفت بر تو چہ رفت از بر تو جانانے
تو خود خیال کن آخر رود چہ بر تو دمے | کہ از وجود عزیمت بدر رود جانے

ایں نگویم کہ کس ز مردن کس | یہ عجب درد و غصہ می کاہید
خود بہر دم دمے کہ بر گذرے | پیر مردے بہ نزع می نالید
ایکہ پری ز عشوۂ دینا | ہرچہ گویم می تواں فہمید
درد سر داشت گفتہ و گویند | پیر زن صندلش ہمی مالید
دشمن و دوست جملہ حیرانند | چہ منم ایں دم و چہ حال مزاج
ہمہ عیسیٰ دماں فرد مانند | چوں مخبط شد اعتدال مزاج
اے معالج ہمیں یہ بیمارش | وقت رحلت اثر کند نہ علاج
نہ دعا کارگر شود نہ دوا | نہ عزیمت اثر کند نہ علاج

باب ہفتم

جدال سعدی

ببیں ایں را و آں را ایکہ گوئی | لئیماں را بدست اندر درم نیست
کریم من دلے دانم کہ ہرگز | کریماں را بدست اندر درم نیست

ولہٗ

چو جویم خوں مفر ماخوں چہ باشد | چو خواہم غم مدہ فرماں کہ غم نیست
مبادا اینکہ گویم اے خدا وند | خداوندان نعمت را کرم نیست

ولہٗ

تو اے فقیر چہ آرے بجز فغاں بر لب | تو اے فقیر چہ داری بجز پریشانی
تونگراں را عیش است و خوشدلی و نشاط | تونگراں را وقف است و نذر و مہمانی

ولہٗ

بیا و از من درویش هم ببین یک ره — که وسعی و بدمستی و غزل خوانی
تو ای که گویم آید چه خوش ز سلطانان — زکوٰة و فطره اعتاق و هدی و قربانی

ولہ

تو و همین که بظاهر چه راحت است مرا — تو و همین که بهر دم ز در تیغ پنهانی
شهان هر آنچه کنند ای فقیر دشوار است — تو که بدولت ایشان رسی که نتوانی

ولہ

بزلف کیست خیال تو و کنی چه نماز — دل تو درهم و جان هم بصد پریشانی
غرض تو تفته کجائے و آید از تو کجا — جز این دو رکعت و آن هم بصد پریشانی

یک قطعه به تضمین استعانت

اے که غم را گرفتی از وے باز — چه خورد تفته و دل و جانش
شب پراگنده خسپد آنکه پدید — نبود وجه بامدادانش
خط او آنقدر نه دل بے وجه — برد و هم می برد ز جانانان
تا زمستان بسر برد بفراغ — سور گرد آورد بتابستان
نفقه میکش نه آنچنان بود است — یک دو قلزم کجا قرا دانش
مے اگر میدهی فراوان ده — تا فراغت بود زمستانش
نه بینم بحق مشتغل چون ترا — ترسم شوی روز محشر خجل
گرای دل خداوند درد و غمی — خداوند نعمت بحق مشتغل
نه در رقص جان و نه در نغمه لب — نه در عیش ما و نه در خنده دل
مپرس این که ای غم ترا حال چیست — پراگنده روزی پراگنده دل

رباعیات

ای که خرد ترا چندین سخن پیچ — کافر پیچ است پیش تو مومن پیچ
آخر چه ازین گوش خراشی سود ت — ای طبل بلند بانگ و در باطن هیچ

ولہ

هان تا چه باین پیر کنی وقت مپیچ — وقت است چه تاخیر کنی وقت مپیچ
ای از تو نخورده رهروی پارهٔ نان — بی توشه چه تدبیر کنی وقت مپیچ

ولہ

ای زاهد صد ساله نداری چون هیچ — دانی که چه مشکل فتدت وقت مپیچ
یک دانه ز خرمن نکوئی کا نیست — تسبیح هزار دانه بر دست مپیچ

ولہ

زنان و نفقه چه آری بلب سخن زین نوع — زفقه و فاقه چه رانی حکایت ای درویش
تو خود بیاب که کردی کدام کار نکو — مکن ز گردش گیتی شکایت ای درویش

ولہ

چو مایلی بکسی نفقه از بلا چه سخن — چو عاشقی نه عجب این که از قلق مردی
مکن ز خال و خط و زلف یار خود گلها — که تیره بختی اگر همرین نسق مردی

ولہ

مباش تنگ دل و دستگر مردم شو — خدای را چو دل و دست کامرانت هست
بنه بدست فقیری ز صدق دل چیزی — تو نگرا چو دل و دست کامرانت هست

ولہ

بسیم و زر سر دینا و آخرت باید — چه سود ازین که نه بخشیدی و نه خود خوردی
بده یکار که این هر دو عالم از تو بود — بخور ببخش که دنیا و آخرت بردی

باب هشتم

رباعیات

ظاهر نه چنین لطیف و خوشتر باشد — ظاهر همین لباس و زیور باشد
از باطن کس شود نه هر کس آگاه — بس قامت خوش که زیر چادر باشد

ولہ

اے شیخ کہ ترا چہ در سر باشد　　نا دیدہ بکس عشق نہ بہتر باشد
روئے کہ نہفت است عروس دنیا　　چوں باز کنی مادرِ مادر باشد

ولہ

اے کہ ایں لحظہ می کنی انکار　　زانچہ بر تو گذشت آنجا دوش
اگرت طعنہا زتم بشنو　　وگرت سرزنش کنم خاموش

ولہ

زروزہ و زنماز و زتقوی و زورع　　کراست تفتہ دریں شہر ہرچہ با تو ہست
بیا و می خور و بر ہرچہ ہست دست فشاں　　کند ہر آئینہ غیبت حسودِ کوتہ دست

ولہ

بجاست دشمن اگر جا بجا بدم گوید　　کز و جواب تبا بد نمودم انچہ سوال
جز ایں چہ چارہ ہما تاکنوں چناں کس را　　کہ در مقابلہ گنگش بود زبان مقال

ولہ

بیا در گوش گیر از گنج اسلاف　　بجود دارم یکے پارینہ گوہر
ہنر بہتر ز گنج گوہر آمد　　ہنر بنماے گر داری نہ گوہر

ولہ

دیدم یکے را کہ بآں گوشہ نشینی　　می گفت کہ دنیا نہ زما گوشہ نشیند
آرے چہ نشیند بدلش جز غم دنیا　　عابد کہ نہ از بہر خدا گوشہ نشیند

یک قطعہ بہ تضمین استعانت

سحر گشت شب از ترک و اختیار فلاں　　کہ گفت سعدی شیریں زبان سحر بیاں
ہزار بار چراگاہ خوشتر از میداں　　ولیکن اسپ ندارد بدست خویش عیاں
سلاطینِ جہاں بودند از دل　　ز بس مشتاق دید آں مہ جبیں را
پئے نقش انچہ جی بالبست گفتن　　فریدوں گفت نقاشان چیں را

چہ عیب ار گفتی اہل خانقہ را ۔۔۔ کہ شمع بزم ما ہر شب فروزند
یکے گفت است اینان را ازیں پیش ۔۔۔ کہ پیرامون خرگاہش بدوزند

رباعیات

دانی کہ کدامین دو کس اند ہمہ خوار ۔۔۔ وز خواری خویش پیش ما قابل دار
مفتی کہ بحیلت طلبد پنج درم ۔۔۔ قاضی کہ برشوت بخورد پنج خیار

ولہ

دہقان پسرا تو ہوشیاری بسیار ۔۔۔ ویں قاضی مرتشے بغایت طرار
برداری اگر بحیلتے پنج انگشت ۔۔۔ ثابت کند از بہر تو دہ خربزہ زار

ولہ

ازیں کلام ندانم چہ باشدش مقصود ۔۔۔ وزیں سخن نیم آگہ چہ داشتہ است مراد
نگفت ہیچ از ابری و طرفہ ایں گوید ۔۔۔ ورت زدست نیاید چو سرو باش آزاد

ولہ

ہر کہ مرد گزیدہ است اصلا ۔۔۔ نگزیند بخیل فاضل را
من نہ تنہا بپوشم از وی چشم ۔۔۔ کس نہ بیند بخیل فاضل را

تا چہ بعد از غضب شود عیار ۔۔۔ آنکہ چوں بحر در غضب جوشد
گوید اے نقد خوش ہنر مندی ۔۔۔ کہ نہ در عیب گفتنش کوشد
ایں بلیہای عام بیہدہ گوست ۔۔۔ واں یدلہای خاص رہ دارد
گر بخیلی بصد ہنر ممتاز ۔۔۔ ور کریمی دو صد گنہ دارد
قلمش نکتہ ہا فرد بارد ۔۔۔ رقمش عیب ہا فرد پوشید
نقد بود است عیب اگر ہمہ تن ۔۔۔ کرمش عیب ہا فرد پوشید
ز نظم دگر کس کہ تا آوردہ بہ ۔۔۔ من و نامۂ خویش آراستن
غرض اے توانگر خوش آمد مرا ۔۔۔ کہن جامۂ خویش پیراستن

یآزاد مردے چہ منت نہی　　وے واز در آرزو خاستن
کہن جامۂ سرداے نوبہار　　بہ از جامۂ عاریت خواستن
گفتن شعر را کہ گوید بد　　نیک بینید ماچہ بد کردیم
در بگو بید ہرزہ گوئیہاست　　ما نصیحت بجاے خود کردیم
دوستاں گر خورید حیف بما　　کاینقدر از چہ ما جگر خوردیم
نتواں بر دچوں بسر بے شغل　　روزگارے دریں بسر بردیم
ایکہ گوئی تو گفتی انچہ کنوں　　در نباید بگوش رغبت کس
ڈر نکو سفتہ ام وے چہ کنم　　گر نباید بگوش رغبت کس
یارہا گفتم د دگر گویم　　غزل تفتہ باغ باشد وبس
گر نباید کسی بہ گلگشتش　　بر رسولاں بلاغ باشد وبس

تضمین گلستاں.
مطبوعہ مطبع نول کشور کانپور ۱۸۷۳ء

انتخاب از غزلیات

از تو اے جان کاردانی ہا | دلستانیست جانستانی ہا
وصل ہم دست داد من خاموش | داد از دست بے زبانی ہا
خاک گشتم من و تفتیش نیست | خاک بر فرق بدگمانی ہا
در سوال من و جواب کیست | ارنی ہا و لن ترانی ہا
از تغافل نگاہ او پیداست | دیدم آن دیدن نہانی ہا
پیش ازیں داشت او ہم بحل | پس ازیں ماو شادمانی ہا
مرحبا وضع خوش ادائے دوست | حبذا طرز خوش بیانی ہا
من کہ جاں برکفم دریں میداں | میدہم داد جانفشانی ہا
بر نخیزد اندم کس از در دوست | زور قربان ناتوانی ہا
دل فدائے نشانہ گشتن خویش | تحفہ قربان شیخ کمانی ہا

بیتابی تو در چمن ہا | سنبل ہا سرو ہا سمن ہا
کو برگ گل دگر لب او | یا شد بخموشیم سخن ہا
مستان ترا کہ داند اسرار | بے خویشتن و بخویشتن ہا
دلہا رابیں و دیدہا را | برہم شدہ بی تو انجمن ہا
آوارہ ہمیں نہ صبر عشاق | عشاق غریب در وطن ہا
خاکستر دل کجا نشیند | جمع است بسینہ سوختن ہا

یکبار رکش کہ بود ایں ئو — داریم بدوشِ خود کفن ہا
یارب چہ وزیدہ در چمن باد — گلہا زدہ چاک پیرہن ہا
آں طرہ نسیم را طلب کرد — ایں مژدہ برید در ختن ہا
یا نفتہ بفہم تست فہمے
یا در سخنم بود سخن ہا

رو مپرس آغاز و انجام مرا — بیں پُر از مے ہر زماں جام مرا
جاں ثمن معلوم و گوید قاصدش — از چہ دید ایں گونہ انعام مرا
چوں از و پرسم کرا گویم دعا — زیر لب گوید کہ دشنام مرا
میکنم طوف حرم بت در بغل — ریط با کفر است اسلام مرا
بُردتم با دوست قاصد گر نہ ہر — چوں نیاید برو پیغام مرا
در امیدش جانم آید گو بلب — کی کند آں لب ادا دام مرا
ہر قدر ہا عیب در خود کامی است — گفت باید یار خود کام مرا
چند سودائی مرا خوانند خام — پختہ سازای سوز دل خام مرا
خوانارہ است از صبر عمرے در سرم — رام نتواں کرد آرام مرا
نفتہ ام من نفتہ دشمن را زیاں
جملہ سوزد چوں برد تام مرا

کردم از دنیا حذر قصد دگر دارم بیا — آمدم تنگ از دہر عزم سفر دارم بیا
گر بخوں غلتیدن دُمردن ندیدی از کسی — زخم پیکان تو در دل کارگر دارم بیا
صد جفا بل بیش بر من شب زہجران تو رفت — یک نفس بل ماتم چوں شمع سحر دارم بیا
در دست یا عیش ابد یا عمر یا عہد شہاب — تا چہ رفت از من کہ بر لب بیشتر دارم بیا
یا بر دل از در بتہ دست از حیات کن شوی باکسی — چشم تر دارم ببیں حالت بتر دارم بیا
دل ایندم یک دو آہ ناتواں باقیست — برلب اکنوں یک دو حرف مختصر دارم بیا
شکر دادست بیدادی کہ صدرہ داد ازو — اے قیامت انتظارت بیشتر دارم بیا

از تو لب ای نالہ ہم سوختن دارد بہ دو — دز تو من ای گریہ امید گہر دارم بیا
آں قد و رخ در دل و دل جلوہ گر در چشم تر — سرو و گل در باغ و باغ اندر نظر دارم بیا

تفتہ مقصودم ہماں تیغ و تر بیم خوی او
غیر ازیں حرفے نگویم درد سر دارم بیا

کاہ مہتاب کہکشاں مہتاب — از زمیں تا بآسماں مہتاب
جسم بے روح گر شب تارست — روح در جسم بیکساں مہتاب
شب وصل است و پر لیم این است — پیر صبح است و نو جواں مہتاب
از لب بام او نمی جنبد — گویا ہست ناتواں مہتاب
بمن آں ماہ میکند ہر شب — میکند انچہ با کتاں مہتاب
تابش از نازکی نیارد یار — بکہ گوید غم نہاں مہتاب
عشرتم راے کہن صامن — شادیم را مہتاب
تیرگیہا کجا در ارض و سما — ہر دو راہست درمیاں مہتاب

چہ سبب تفتہ بر غم دلم
نیست امشب نمک فشاں مہتاب

سر بسر بے سود تدبیر من است — تا ز من برگشتہ تقدیر من است
ہست فریادم نہ تنہا دلخراش — نالہ ہم گوئی گلوگیر من است
قبلہ جان کعبہ دل کو دگر — ہر کرا خوانند غم پیر من است
نارسا از برق بہ گردد ز راہ — نالہ گوید طرفہ تاثیر من است
من کہ داغستانیم از فرط داغ — آں مخطط چہرہ کشمیر من است
گر سر خصمی بمن دارد فلاں — در کف من خامہ شمشیر من است
ایکہ پرسی حیلہ ام آئینہ بین — حیرت آئینہ تصویر من است
نیست از دل التفات یار ترتیبہ — گوئی ایں خود بہ تقریر من است

خوانده ام درس خموشی من ازو

تفتہ میداند چہ تقریر من است

تو ایں مگو بہ میانجگری سپر محتاج — کہ سر بہ تیغ تو و تیغ تو بسر محتاج

نہ آں قدر ہمہ عالم بیک نظر مشتاق — کہ بندۂ زارِ دل من بیک شرر محتاج

چہ بادۂ کہ نیارد بہیچ گونہ خمار — چہ سادۂ کہ نباشد بگیرہ و قر محتاج

منم کہ تیرگیم را تجلیست چراغ — کہ داند اینکہ بشامم کہ شد سحر محتاج

سوالی از کسی البتہ ننگ ہمت ہاست — کنند نہ ہر کسی ایں کار را مگر محتاج

نہ ایں نہ آں نہ فلاں نے فلاں و درس دو الی — ہر آنکہ ہست غنی قصہ مختصر محتاج

مباد خوار نشود سنگ سنگ گرد دغار — مباد پا و سر ما بیک دگر محتاج

فرشتۂ اجل است آنکہ در پدر گردد — سگ در تو نگردد بہیچ در محتاج

بفیض سجدۂ بیخانہ نگاہ کسے

مباد تفتہ الٰہی بما حضر محتاج

شد عدوے جانِ ما مژگانِ شوخ — وز کجا شد تا کجا مژگانِ شوخ

نے من اورا مبتلا بل صد ہزار — نے بلا بل ید بلا مژگانِ شوخ

من جدا از ہر دو خواہد ز من — دل جدا و جاں جدا مژگانِ شوخ

ملکہ خواہم ہر زمان بیت را خدا — بینش من قہر خدا مژگانِ شوخ

می نیارد نشتری بہر رگم — می تفہمد مدعا مژگانِ شوخ

آنچہ من می داشتم از عقل و ہوش — چشم جادو میبرد یا مژگانِ شوخ

تا چہ کام اوست ببرد دارد چنیں — دست چوں بہر دعا مژگانِ شوخ

دشمنم از چشم تا ابرو دے کج — قاتلم از غمزہ تا مژگانِ شوخ

اینکہ زد خوں دردلم بسیار جوش — چوں نیاید گفت با مژگانِ شوخ

بر نگردد روتہ گار از ما دگر — بر نگردد گر ز ما مژگانِ شوخ

تفته تو با فتنه‌ها سازی اگر
فتنه‌ها سازد بپا مژگانِ شوخ

سوی چشم پر آب می آید — خنده بر وضع خواب می آید

از من آں اضطراب می آید — که نه اندر حساب می آید

رتبهٔ خاکسار نیست بلند — گرد درِ بوتراب می آید

دل کرا سوخت زیں ستم آشناں — از که بوی کباب می آید

شیب می افگند دمی کمر پائی — یادِ عهدِ شباب می آید

درِ دل را مگر شکست کسی — مژدهٔ فتح باب می آید

می روی از دل و نمیدانی — چه بجانِ خراب می آید

پای او را دگر که نیست حنا — خوں ز چشمِ رکاب می آید

آنچه آید نه از فلک زنهار — از تو عالی جناب می آید

ما گدا از یم و گوید آں گل تر — تا چه بوی گلاب می آید

نامه‌ای دل نوشته‌ام با اجل — مرو از جا جواب می آید

دردها از تو داغها از من — تفته روزِ حساب می آید

کاش یک شب پرده از رخ بی‌حیا میکشود — آنکه بر رخ از ادا زلفِ چلیپا میکشود

خانی از حکمت نمی زد زخم بر هر عضو ما — تیغ او گوئی طلسم جسم ما را میکشود

وی شدم جائی که آنجا خامشی درکار بود — مجمعی بود و زبان هر یک بگویا میکشود

هشت جنت خوش از رندی بود کاں سنج صفات — باده ایں جامی کشید و راه آنجا میکشود

هست بهر زخم تو آغوش زخم سینه ام — همچو آغوشی که بر یوسف زلیخا میکشود

وقت میخواری چو میزد حرفی از مژگان او — دل رگ ابر بهاری را بهانا میکشود

انجا بدم عیشی پیش فقیهان زماں — عقدهای خاطرم یک جام صهبا میکشود

آنکه می گفتی بحشر هم نیایم داد خویش
نقد امروز تو گویا راز فردا میکشود

غم از همه عیش جانفزا تر — بیگانه تر آنکه آشنا تر
هر دم ستم تو خوشنما تر — دلها همه خون و دیدها تر
کے خاک رسد بر تربه یاد — من نارس و آه من رسا تر
هر چند که بے نوا من از بس — از من نے ناله بے نوا تر
می تر همه گرد باغ تو خشک — ای شیخ توری نه چون عقدا تر
هجری که بمرگ بایدش داد — از مرگ هم است بدبلا تر
نه بجا گره اے بتاں چه حاصل — از ما گره شما بجا تر
گفتی که رو امیا دکاسے — پیش تو رواست نارواتر

گر نقد تو آئی از پئے سیر
دشنه است مرا چه خوش قضا تر

از رخت یک گل نه تنها در نظر — باغ ها در دل چمن ها در نظر
حور کو جنت کجا غلماں کدام — اے ادا ہائے تو مارا در نظر
خنده بر لب می لبریز ساغر یکطرف — وی خوش آمد ساقی ما در نظر
پُر شد و لبیار پُر شد زین سپس — اے فراواں جلوه کو جا در نظر
ساقیا وقت است دیگر از وقت نیست — هر چه دارد مرد دانا در نظر
هادی ما مرشد ما پیر ماست — هر که در دنیاست عقبا در نظر
چشم ظاهر بیں الٰہی کور باد — دوست هر جا هست الّا در نظر
تیر یار و یاد مرگ و روی یار — یا به پہلو یا بدل یا در نظر
پر کشش آئینه باشد و بدی — تا چه می دارد تماشا در نظر

چشم باید بست امروز از جہاں
تا چه آید نقد فردا در نظر

در باغ لاله را بدمیدن رسید کار — گوئی مرا بجام کشیدن رسید کار
قاصد رسید و گفت که کار تو شد درست — حرف دروغ را بشنیدن رسید کار
چشم غزال دیدم از خود دگر ربود — صبر مرا دگر برمیدن رسید کار
در حیرتم که ز آتش رویش چرا نسوخت — چشم مرا چگونه بدیدن رسید کار
آنجا کبوترم نه اگر صید دام شد — هوش مرا چرا بپریدن رسید کار
دل گفت بخلش ترسم به مراد خویش — خار ترا مگر بخلیدن رسید کار
چوں گفتمش که گوشهٔ چشمی نه چوں بمن — گفتا که گوشه را بگزیدن رسید کار
دل قطرهٔ و چوں مدہی قطرهٔ میم — گویند ہمیں مرا بچکیدن رسید کار

بگشود تفته نیز زباں را چو گفت اسیر
"راز نگفته را بشنیدن رسید کار"[1]

عجب حالیست طاری برمن امروز — نگرید چوں بحالم دشمن امروز
بمن از ناامیدی خرمن امروز — نه امید وفا یک ارزن امروز
چها دیروز با تو خوردمی مے — نصیبم جای می خون خوردن امروز
تو نسل بو البشر را خصم و از تو — نه یک فرد بشر هست ایمن امروز
وصال تو نصیبم چوں نگردید — فراق افتاد در جان و تن امروز
توئی آں گل که وصفت گو نه گوں من — شنیدم از زبان سوسن امروز
کشیدم وی نه یک ساغر بو جہی — کشم من گر وی می صد من امروز
بیا یک رنگی گل بیں به بلبل — تماشائیست خوش در گلشن امروز

شهادت گه نه چنداں تفته دور است
چه افتادی چنیں در مسکن امروز

آنکه گوید متهم آں کام یاری که مپرس — دارد از پرسش ایں دل شدہ غارتگر پرسا

---

[1] جلال اسیر ۔ راز نگفته را بشنیدن رسید کار — تخم نکته را بدمیدن رسید کار

استخواں سوزے تپے راچہ دہم شرح جزایں — پنبہ زاری و دردِ بست شراری کہ مپرس

آنکہ وی مرد چہ می پرسشِ احوال ایں بیں — تیر دِ آہے زلیب تازہ مزاری کہ مپرس

عیش تو روز وطن ماکی عید است کجا — بیکشیم نالہ سزاری شب تاری کہ مپرس

بشمار ایک کتی برکتاب حیرم ستم — ہست پیش آمدنی روز شماری کہ مپرس

نہ شفیقے، نہ شفیقے، نہ غم دل شنوی — یدومارا فلک دون بدیاری کہ مپرس

ایکہ پرسی کہ ترا کرد چنیں دشمن کام — دوستداری کہ چگویم من بیاری کہ مپرس

ہندوی زلف تو آں دشمن دین است کہ ہیں — آہوئے چشم تو آں شیر شکاری کہ مپرس

رفت بر باد پس از خاک شد نہاد ہنو نہ
ہست در خاطرش از نقّہ غباری کہ مپرس

دردا کہ درد ما نشنیدہ است ہیچ کس — زنہار جز خدا نشنیدہ است ہیچ کس

عشرت قرین ما نشنیدہ است ہیچ کس — از غم مرا جدا نشنیدہ است ہیچ کس

آہ از گلی کہ لب نکشاید بکس ز — پیغامش از صبا نشنیدہ است ہیچ کس

ما و غم فراق کہ آخر کند ہلاک — ایں درد را دوا نشنیدہ است ہیچ کس

گو مدعی بنوع دگر میکند بیاں — زو حرف مدعا نشنیدہ است ہیچ کس

تمکین او ستہ آنکہ چہ رانم سخن ازاں — از کوہ او صدا نشنیدہ است ہیچ کس

گو آمدہ است قاصدی از کوی او ولی — جز مژدۂ بلا نشنیدہ است ہیچ کس

گویم چہ ایں کہ روی تو با مہ برابر است — خورشید را سہا نشنیدہ است ہیچ کس

با نقّہ ہر چہ می نسزد گر چہ گفتہ بہ
از نقّہ نا سزا نشنیدہ است ہیچ کس

خوں گر دو ہر دم از مژہ ای دل چکیدہ باش — جای رسیدہ باش وہماں نا رسیدہ باش

تا کام تر کسے کہ بود آرمیدہ تر — رام تو کام می شود از خود رمیدہ باش

گر عاشقی بگلشن فردوس رو مکن — در دامن امید گل یاس چیدہ باش

انجام رنگ و بوی اگر در نظر بود — صد رنگ دیدہ باش و دو صد بو شنیدہ باش

ایں کو ہماں و قاتل خنجر بکف ہماں — اے دل ترا اگر گفت برو آرمیدہ باش
وصل کیست وصل تو اے تیغ کسے — یکدم بہ پہلوئے من ہجراں کشیدہ باش
دندان تست تیز گراں گو نہ جان من — بر خود میاز ما و لب ما گزیدہ باش
پیش آرد انچہ گردش گیتی قبول کن — بنماید انچہ آئینہ چرخ دیدہ باش
از دیر برہمن چو سخن سر کند شنو — وز کعبہ شیخ دم چو زند بے عقیدہ باش

تا نفتہ غیر ازیں چہ مرادت ز شاعریست
مضمون نامرادی خویش آفریدہ باش

من چہ بگویم دگر از کار خویش — بست ز کوئے تو دلم بار خویش
عذر کہ در آمدن آری چنیں — یاد نیاری ز چہ اقرار خویش
حکم پئے گریہ مفر ما بمن — رحم بکن بر در و دیوار خویش
پیش خدا ہم نکشائے نقاب — دانی اگر خوبی رخسار خویش
راندیم از برم بدیں سان چرا — خواندیم از تار اگر یار خویش
خفتہ ام اندر لحد و میکنم — ناز چہ بر طالع بیدار خویش

تو چہ کنی سر زنشم زاں سخن
خود خجلم تفتہ ز اظہار خویش

فغاں از خنجر چشم سیاہش — دگر فریاد از تیر نگاہش
نیم خواہی نخواہی داد خواہش — نمی دانم چہ رو داد اشتباہش
رخ جاناں ہماں ماہ تمام است — کہ چشم من ندید از چند ماہش
کشش دانم نہ از عرش معلا — کجا بارم بعالی بارگاہش
خوشا آں مہ دگر خوباں مطیعش — فدائے آں مہ انجم سپاہش
دلم گر توبہ از نے کرد آں خود — گناہ آمد خدا بخشد گناہش
کسی کو قد موزون تو دیدہ است — بود سرو گلستان دی آہش
ہمی آنکو فراموشت نسازد — چہ سازد گر یزی گاہ گاہش

سخن رانی چه از رفعت پناهی　　قدت سروی و رفعت در پناهش

چو گفتم این تبسم تفته را کشت

بخندید و بگفتا کو گواهش

این دم چو نه آن سرِ روان است درین باغ　　هر برگِ گلم آفتِ جان است درین باغ

تا بر جگرِ بلبلِ دل‌خسته چه آید　　در دستِ گل از تیره‌شان است درین باغ

حیف است اگر گل همه تن گوش نگردد　　بلبل همه تن سحربیان است درین باغ

گر منتظرِ آمدنِ نوگلِ من نیست　　نرگس همه سو چون نگران است درین باغ

تو نیز بتره ام که بجز لاله نکارد　　بنگر که چها لاله‌ستان است درین باغ

هر لاله و گل بر صفتِ داغِ دلم گیر　　رازم نه نهان جمله عیان است درین باغ

یکسو سمن و سنبل و یکسو گل و ریحان　　بخرام که سیرِ دو جهان است درین باغ

از تفته چگویم که به پیری است چه حالش

صبح است و چو شبنم دو سه آن است درین باغ

مردیم بد شمنان مبارک　　رفتیم بآن جهان مبارک

این رتبه ات الفلان مبارک　　شد خاک درت جنان مبارک

مژگان چو بهم زدی فلک گفت　　جنبیدن این سنان مبارک

زان پیش که خون خورد ز بیتم　　شد دشمن آسمان مبارک

در دل چو گرفت جا غم او　　گفتم به مکین مکان مبارک

بر من چو خدائی من نه بخشود　　شد عشق خدایگان مبارک

او تیغ زد و دم الصد ذوق　　دل گفت که امتحان مبارک

زان صبر که گشت گم دلم را　　تا یافتن نشان مبارک

بیجا شده بود جسم و اینک　　بی‌مغز شد استخوان مبارک

ما را که محقریم یکتا　　کو صدر یک آستان مبارک

مرگی کہ بہ تفحہ کینہ ہا داشت
امشب شدہ مہربان مبارک

خدارا خانہ باشد خانۂ دل
من عاقل تو شاد دیوانۂ دل

ز صدہا گوہر یکدانہ خوشتر
تشارت گوہر یک دانۂ دل

ز اشک او کہ سیلاب است می ترس
ردای آبادی از ویلۂ دل

بجاکیٔ دل نگر تکشودہ چشم
پئے زلف تو شایان شانۂ دل

یکے حسرت دوم اندہ سوم درد
چکد دیگر چہ از پیمانۂ دل

غمت چوں اندرو شد جنتی شد
کم از جنت مداں کاشانۂ دل

زند خود بر دم خنجر کہ زینساں
فدائے ہمت مردانۂ دل

نہ خالی یک نفس از ذکر خیرش
فسوں گر چشم او افسانۂ دل

حدیث آشنایان مختصر کن
مبادا غم شود بیگانۂ دل

چو گفتم تفتہ چیزی ے فرد شد
بگفتا یک نگہ بیعانۂ دل

چنیں بت کجا بت چنیں گل کجا گل
بہ بتخانہ ہا بت بہ گلزارہا گل

ببیں ریخت دوراں چہ رنگ تماشا
بہ گل مبتلا من ہاو مبتلا گل

ہوای گل او را کشد تا گلستاں
ندانم کہ در سر چہ دارد ہوا گل

منم بلبل آنکہ وصفش چہ گویم
نگارم گل است و جہاں خوشنما گل

دم نشہ در صحن بستاں دلم را
خوش آمد چو پیمانۂ مل خوشا گل

چہ خوش گلگل از می شگفتی دم صبح
بیا در چمن ای برویت فدا گل

گفتیم ایں سبق کاش از بر من و تو
تو بلبل مرا خوانی و من ترا گل

نہ بے تو کشد از چہ آہ رسا سرو
نہ بے تو درداز چہ جیب تہا گل

مپرس ایکہ چوں میروی تفتہ در باغ
دل اندہ نصیب است و اندہ ربا گل

چہ می خواہد سکونِ جاں علاجِ اضطرابِ دل — ملالِ بے شمارِ جاں نشاطِ بے حسابِ دل

دوم بجو دِ بصحرا اگر کسی جوید نشانِ من — بگویم مست و شیدا اگر کسی پرسد خطابِ دل

اگر صد ہا نسخ بینی نخوانی غیر ازیں مصرع — غم او انتخابِ دل غم او انتخابِ دل

کنوں در ہر سوال او چہ بندی البتہ آئیں — چہ خواہی گفت پیشِ داورِ محشر جوابِ دل

چرا منت کشم زنیساں ز ساقی تا کشم آں را — نباشد از شرابِ خمر رخ کمتر خونِ نابِ دل

تمنائے عدم دل را چو از جان بیشتر باشد — برابر کی تواند شد و رنگ جانِ شتابِ دل

کسے کو بشنود آں را کجا ماند بحالِ خود — تو کے بشنیدہ باشی جانِ من حالِ خرابِ دل

دلِ من آنکہ از حق ہر چہ خواہد در دمی یابد — نترس اے رفتہ از دل از دعا مستجابِ دل

توئی دلجو توئی دلبر توئی دلدار شیرنگار — بغیر از تو کہ یابد مدعائے کامیابِ دل

بیا ساقی کہ وردِ تفتہ اکنوں غیر ازیں نبود
بفصلِ گل شکست توبہ باشد فتحیابِ دل

زبس عبرت از اہلِ دنیا گرفتم — کمر بستم و راہِ عقبا گرفتم

چہ گویم چہ دیدم ترا تا شنیدم — چہ گویم چہ دادم ترا تا گرفتم

تو در جلوہ کن جلوہ تو کز تماشا — اجازت برائے تماشا گرفتم

اگر مدعی حرف گیر است من ہم — قلم در کف ایں جا بگو اگر گرفتم

دلِ من بملکِ طرب تاخت آورد — من اقلیمِ غم را سراپا گرفتم

بمستی کہ جیبِ صبوری دریدم — بوحشت کہ دامانِ صحرا گرفتم

توئی کایں ہمہ اشک و آہم نمودے — ستم کز ثری تا ثریا گرفتم

تو سرتا سرائے بر خموشی گرفتی — من ارض و سما را بغوغا گرفتم

من آنم کہ گر در سرِ مرگ گشتم — بدشمن طریقِ مدارا گرفتم

نمک آب شد خندہ ات تا بلب زد — شکر ریختم بوسہ ات تا گرفتم

چہ دیدم کہ پیمانِ حسرت شکستم — چہ کردم کہ کامِ تمنا گرفتم

زکس ہیچ نگرفتن آمد عجب فن
دریں فن ترا تفتہ یکتا گرفتم

غلط است ایں کہ بخود لطف شماتی گویم　　انچہ ہرگز نتواں گفت چراتی گویم
شکن زلف ترا یال ہما می گویم　　دیں چگویم کہ چہا زلف ترانی گویم
ہست رازی کہ بخود نیز نیاید گفتن　　انچہ با غیر جدا با تو جدا می گویم
شادیش یک طرف انجام تفہیم آں را　　بشنوم گر ز تو حرفے ہماجاتی گویم
ہر چہ در زیست نگفتم نشنیدی اکنوں　　از جہاں میردم و با تو دعاتی گویم
تو نمی گوئیم اے جان تغافل کہ برو　　یا اجل من بہ تشاطی کہ بیاتی گویم
ہر چہ می گویمت از بیکہ یتیم آخر بیں　　نخلا گفتنی است و بیلاتی گویم
پیش ازیں در صفت شاہ قصاید گفتم　　مرد امید و کنوں مرثیہ ہاتی گویم

تا چہ سرخوش شوی اے تفتہ ازیں تمہیدم
پیش ساقی سخن از ابر و ہواتی گویم

مستم آں کہ خود را پیش دل ہشیاری دانم　　دل خود را ز جام بیخودی سرشاری دانم
بسے انکار را اقراری دانستم و اکنوں　　چو تو میدم بسے اقرار را انکاری دانم
چنانم گریہ را مشتاق و زانسانم ز خود رفتہ　　کہ زخم خونچکاں را دیدۂ خونباری دانم
من و از سعی بخت خود شدن و ز خوابگاہ او　　عجب دیوانہ ام کایں خفتہ را بیداری دانم
چو پرسم یا فلاں کس شب کجا ماندی بگو گریم　　کہ من او را تمی دانم منت عیاری دانم
چہ گفتی ایں کہ تو سود و زیان خود نمی دانی　　تو بودی پیش دلالی سر بازاری دانم

تو شعر تفتہ را از نام خود اے آں کہ می خوانی
نہ گفتار سنت چنیں من طرز ہر گفتاری دانم

بیا خال جبین انورش بیں　　چہ تابد بر بلندی اخترش بیں
اگر صد سال جستی دیگرش جوئی　　دگر صد بار دیدی دیگرش بیں
بچساں افتد زمیں در پاش بنگر　　بچساں گردد فلک گرد سرش بیں

دہی جاں ہر کرا نادیدہ اینست — بیا عیسیٰ لب جاں پرورش بیں
زصد گلزار خوشتر می نماید — گلی برسر بگلزار اندرش بیں
کسے کز خضر می جوید سراغے — تراز خون مسیحا خنجرش بیں
پہ حامی تا ید امشب ہمہ بگردوں — پہ حامی گردد ایں دم ساغرش بیں

کہ می گوید ستانش را نماند آب
بہ نعش تفتہ مژگان ترش بیں

بیا زاہد لب پر شکرش بیں — بہشتی ہست رویش کوثرش بیں
نگویم غمزہ غارت گرش بیں — معین غمزہ چشم کافرش بیں
چہ رفتار است رفتارش تواں یافت — چہ محشر گردد بر پا محشرش بیں
تدیدی گرش بیدین مارا — رواج کفر اندر کشورش بیں
گروہ بے کساں بر رہ گزارش — ہجوم داد خواہاں بر درش بیں
یکے مرغ دلم تو میداز اں بام — دگر روح الامیں بال و پرش بیں
چنیں فصاد جاں پرور کہ دیداست — رگ جانہا فدای نشترش بیں
کسے کافتادگی از سر گرفت است — بزیر پا مقام برترش بیں

حساب تفتہ پیش از حشر شد پاک
خدایش را نگر پیغمبرش بیں

بزم احباب را تماشا کن — عالم خواب را تماشا کن
ہفتہ بیش بتو دایں سر برگ — گل سیراب را تماشا کن
آدمی تا چہ کرد و تا چہ کند — قطرۂ آب را تماشا کن
مردم از نقد و جنس ہیچ مگوی — رقم اسباب را تماشا کن
نفع و نقصان دو یار غار ہم — بحر و گرداب را تماشا کن
دل دکان وفا کشود بیا — جنس کمیاب را تماشا کن
در کاشانہ تا سحر باز است — چشم بے خواب را تماشا کن

عشق را از ادب سلام کنم　　حسن آداب را تماشا کن

گردشِ چرخ را دگر چه نظیر

تفتہ دولاب را تماشا کن

غمت ہست در جسم ساری ببین　　عجب حالتی ہست طاری ببین

چہ بینی سوی غیر و جوی قرار　　موی من نگر بیقراری ببین

ندیدی اگر خندہ ہائی سحر　　ز ند خندہ ہا زخم کاری ببین

ندیدی اگر ماجرای عجیب　　ز روی تو دم شرمساری ببین

توری غم چہ پرسی ریشی من　　جگر خستگی دلفگاری ببین

مسیحا ہم این تو ع پردہ بود　　دمی از خضر جانسپاری ببین

ستم کار مژگان و چشم ترا　　چہ خوش می کند پیشکاری ببین

کنون حال من ہست نا گفتنی　　تو تاب شنیدن نیاری ببین

چہ می بینی این زخم را ای عدو　　خود آن تیغ را آبداری ببین

کنی تا چہ از دردمنداں شمار

بیا تفتہ را دشمنا ری ببین

خوش است تابع تقدیر بایدم بودن　　نہ اینکہ در پی تدبیر بایدم بودن

بیتے کہ گفت ہلاک تو خوشتر است اورا　　ہلاکِ شوخی تقریر بایدم بودن

کہ جز من این ہمہ رنگین سخن یکا عذر ریخت　　چرا نہ حاکم کشمیر بایدم بودن

بپرسد از من اگر رازِ نقش ہستی کس　　مثالِ حیرت تصویر بایدم بودن

تو اینکہ ناوک دل دوز داری اندر کف　　بزن بدل ز چہ دیگر بایدم بودن

ہزار میکدہ بشکست نرگس مستت　　کرا کرا گل تعبیر بایدم بودن

بگفت چرخ شدن طالعت جوان سازند　　باین اشارہ مگر پیر بایدم بودن

بگفتم آن ہمہ تقدیم تو است اکنون　　چگونہ کشتۂ تاخیر بایدم بودن

تو گفتۂ کہ کسی را بخواب گشتم دوش　　دگر بخواب کہ تعبیر بایدم بودن

مراں کہ خاک شوم بر در تو استغنا   زبسکہ نسخۂ اکسیر بایدم بودن
بہ تفتہ آنچہ کنوں میکنی نہ بے وجہ ست
شہید ایں ہمہ توقیر بایدم بودن

تو و او شاہ است و مژگان لشکر او   مسلماں کُش دو چشم کافر او
تواں بر بخت عاشق گریہ ہا کرد   چکد حسرت ز دیوار و در او
دلے دارم کہ لبریز است از زخم   سراو سینۂ او پیکر او
بلا گردِ سرم بسیار گردد   نگردم من چرا گردِ سر او
بجا دعوای یکتائی ازاں داغ   کہ مہر خور بود بر محضر او
دریں میداں عدو گو تشنہ میمیر   چشم من جملہ آبِ خنجر او
پر د چوں نامہ ام خود سوے معشوق   چہ پروائیم ز جبریل و پر او
ز شمشیرش عدو گو چشم می پوشد   بجز عاشق کہ بیند جوہر او
دریغ از غارت دین و دل و ہوش   فغاں از غمزۂ غارتگر او
مپرس از عاشقِ اندوہ شب ہجر   شبِ ہجر است روز محشر او
کند ظاہر نفاق تفتہ و من
لب خشکِ من و چشم تر او

دریافتم از ہدایت تو   اے دل ہمگی نہایت تو
اندازہ نماند اندُہت را   وز حد بگذشت حسرت تو
ہرگز نہ از حقیقت آگاہ   آگہ شدم از حقیقت تو
فرسود زبانم از نصیحت   دیگر چہ کنم نصیحت تو
شد صرف تو ہر چہ بود با من   ایں مفلسیم بدولت تو
یا رحلت تو مسرت او   یا قامت او قیامت تو
خواہاں ملامت تو خلقے است   خواہم ز چہ من سلامت تو
از عافیتِ خود آیدم یاد   ہرگہ نگرم مصیبت تو

بستم ز تو دیدہ یعنی ایں نوع — دیدن نتواں ذلت تو
تا کردہ ترا کہ رخصت از عار — رخصت شدہ تاب و طاقت تو
می گشتی اگر تو بہ ز فرہاد — می داد کہ دادِ محنت تو
با آنکہ تو خویش را بکشتی — معلوم کہ گشت قدرت تو
دو شت بدو کون می خریدند — امروز چہ نیست قیمت تو
بس کن بس کن کشیم دیگر
تا کے من و تفقہ زحمت تو

خضر و مسیح دیگر اندر چہ کار ہر دو — تیغے اگر برآرے امیدوار ہر دو
روز و شب است حاصل یکجی کہ نتواں دید — خورشید و ماہ او را آئینہ دار ہر دو
چوں گفتم از من و دل حرفے شنیدہ باشی — گفت از ادا کہ دانم بے اعتبار ہر دو
خواہ ایں زنند برہم خواہ ایں دہید از کف — بگذاشتم بخوبان من کار و بار ہر دو
می آنکہ ہر یک از من گوید ہر آنچہ گوید — نام مرا چہ پرسی رسوا و خوار ہر دو
دیگر در انتظارت چشم مرا چہ افتد — چوں نقش پائے بینم بر رہگذار ہر دو
احوال لالہ و گل بود است بے تو یکساں — ہم سینہ ریش ہر دو ہم دلفگار ہر دو
بے مصلحت کشادند آغوش کے دل و جاں — زخم ترا کشیدند اندر کنار ہر دو
او مضطرب بقتلم من از نشاط بیخود — معشوق و عاشق ایں جا بے اختیار ہر دو
یاری کہ رفت با او دیگر چہ کار ما را
یعنی کہ یاس و حسرت با تفقہ یار ہر دو

ایں قدر زود کجا آمدۂ — روز حشر آمدہ تا آمدۂ
کس چہ داند کہ چرا آمدۂ — بہر صیدِ دلِ ما آمدۂ
می بسر جام بکف شیشہ ببر — عیدِ مستاں کہ چہا آمدۂ
چشم بد از رخ نیکوی تو دور — چہ قدر عشوہ نما آمدۂ
باغ حسن تو بہ نیرنگی ہا — گل جدا لالہ جدا آمدۂ

گفتی آں وقت کہ کشتم نہ ترا　　یاری اکنوں بوفا آمدہ
تا کجا تشنۂ خوں بود ایں تیغ　　تا کجا کام روا آمدہ
کام دل کس چہ ربا بد از تو　　مست بی ہوش ربا آمدہ
ساقیا چوں نہ دم قربانت　　خوشتر از ابر و ہوا آمدہ
نقتہ اکنوں سے و میخانہ زلست
سر لبید صدق و صفا آمدہ

ایں لحظ از خود م چو مکدر شنیدہ　　گفتی چہ سود ازیں کہ چہ دیگر شنیدہ
زیں سال ترا زسو فلتن ما و تیغ ترف　　پرواز دیدہ و سمندر شنیدہ
ترکیب چشم او کہ کشد یاس را بخوں　　اے دل دگر بدست کہ خنجر شنیدہ
غم بیشتر مرا بود و غصہ بیشتر　　زاں بیشتر ہنوز تو کمتر شنیدہ
خواہش ز رحمتی کمزور رسد اے دل مروز جائے　　زاں بہ چہ رحمتی کہ ز داور شنیدہ
رنگے دگر مید دی تو گل کردہ است شیخ　　بوئے دگر ز بادۂ احمر شنیدہ
ذکر و تا کجا ز تو دلبر شنیدہ ام　　حرف غلط کے از من مضطر شنیدہ
دہر از مگس پر است ز عشاق شاں مجوی　　درویش دیدہ و توانگر شنیدہ
ہر گہ کہ رخش نا زبمیدان دوا زدہ
انجام خاک نقتہ ز صرصر شنیدہ

بدمست کشتۂ و دل ما شکستۂ　　مردم گماں برند کہ مینا شکستۂ
پژمردہ است باغ تمنائے مردہ ام　　خارے بپائے مرگ ہما تا شکستۂ
چوں ایں قدر نہ بادہ بشکرانہ اش کشی　　جام مراد صد چو منی را شکستۂ
گویند شد طرت تو گل باز شد نہاں　　قفل در چمن نہ تو بیجا شکستۂ
از غسل محبت تو کنم شکر باد سے　　پرہیز سال دلم چقدر ہا شکستۂ
بے مطلب ایں تمط نہ برا غنیا وی　　زاہد تو قدر دیا پئے دنیا شکستۂ
پیرا ہن صبوری ما دل شکستگاں　　چاک است چاک طرت کلہ تا شکستۂ

تا از شکست دلیست وی آرم بلب حرف   یالیتہ تو دست مرا یا شکستہ
تابوت رفتہ از در تو ای مرگ اکہ تو   دیوار خانہ بہر تماشا شکستہ
تا این چہ گریہا یغم غرق گشتہ ام   یاد آر کشتی کہ بہ دریا شکستہ

آید چہ از تفقتہ ہمیں پرسیم بطنز
داگہ نہ ہنوز کرایا شکستہ

پایت بچمن نمی گزاری   منت بسمن نمی گزاری
انداز بہ یدل ایچہ داری   جانے ہمہ تن نمی گزاری
لطف تو بزخم ماست بسیار   مشکے بختن نمی گزاری
من شکر گزار این ہم از تو   کے شکوہ زمن نمی گزاری
منصور صفت کسی کہ بینی   بے دار و رسن نمی گزاری
یک گل بچمن بگویم اصلا   یک کس بہ زتن نمی گزاری
من نعرہ زدن نمی گزارم   تو تیغ زدن نمی گزاری
کے لب بکشائی و کے احسان   بر جان سخن نمی گزاری
اینک غم روزہ ات مرا خورد   چیزی بدہن نمی گزاری
دریا کشم در برم تو ساقی   جز یک دو سرمن نمی گزاری
کے زندہ گزاریم تو بناش   بر مردہ کفن نمی گزاری

گر تفقتہ کشی فغاں بخلدی
خلدی بہ جہنمی گزاری

نیست کم ز انکار اقرار کسے   تا چہ باید گفت ز انکار کسے
گفت می آیم کسے را من بخواب   رشکہا بر بخت بیدار کسے
تر دستے دارد دریں دوران وتا   خاصہ در ہنگام اظہار کسے
دولت او بخت او اقبال او   مرگ اگر باشد طلبگار کسے
چون لت ربد جاں از بلائے نوکر من   پیرو دل دل گرفتار کسے

من نخواہم از کسے چیزی دگر | اے صبا بوئے ز گلزارِ کسے
وقفِ حسرت مدعی گوش کیست | نشنوم زنہار زنہارِ کسے
خوارم و ذلت بخوبی دانم | تو چه دانی قدر و مقدارِ کسے
یوسف من غم بروائے خویش دنی | من نمی گردم خریدارِ کسے
سبزه می غلتد چناں کاندر چمن | زلف می رقصد بر رخسارِ کسے
ایچناں کز وعده خرسند است دل | ہمچناں امسال ما پا بر کسے
نحن مطرب عیش جاوید کیست | چشم ساقی جام سرشارِ کسے
گفت دل رد تا چه گفتار دل است | رفتیم از خود تا چه رفتارِ کسے

من کیم بنگر اسیر و تفته را
کس مبادا ایں چنیں زارِ کسے

نمی شود ز چنیں کس خدا چناں راضی | نه دوستاں که ز من جمله دشمناں راضی
چنانکه من نیم از سیر بوستاں راضی | دل من است نه از شاہی جہاں راضی
گماں بمردنم از تو چه جان دگر ندہد | من از یقین تو ناشاد و از گماں راضی
یکیست جان و بہر عضو نگری چون است | ز یک عزیز بود جمله کارواں راضی
کدام سرو پئے سیر رنجه کرد قدم | که تازه رو ہمه باغ است و باغباں راضی
خضر نیم که ز نیم ہرزه بے دمِ عشوق | وگر بزیستن خود مرا مداں راضی
به اشک داوِ من اے بنیوا بگیره بیں | که ہم رکاب چه شاد و چه ہمعناں راضی
خدنگ تو بگذشت از دل و یدل جاں گفت | چه تیر یاں که از و نیست میہماں راضی
مرو گر آمدهٔ از وفا من ہجور | ز مقدم تو اجل راضی و ہجاں راضی

تو حال تفته که پرسی پس ایں قدر که کنوں
بمرگ خود چه قدر ہاست یک جواں راضی

ایں نمی خواہم نسیم با غم اے دل شوی | بر چراغ مدعائے مدعی صرصر شوی
ہم چناں جلادی دلِ تو ابن مریم گر شوی | ہرگز ایں باور نمی آید که جاں پرور شوی

نوش دم صبح و دعا را نیز اثر ایں دم مرا — گر چشانی قطرۂ مے ساقی کوثر شوی
ایکہ گوئی دشمنت را بعد ازیں بینم بمن — گر نہ بینی یکدم او را تا بکجا مضطر شوی
آں قدر نالم کہ بر گوشت رسد صد گونہ بیخ — دانقدر گویم کہ از خجلت نوائے گل تر شوی
گر کشی صد رہ بستم کے از ستم تو بہ کنی — در روے یکرہ بجنبش فتنۂ محشر شوی
تو نصیحت نامہ ہا خوانی و من انغم ہلاک — اے ستم ایجاد می ترسم گرم گستر شوی
وے یمن پیر طریقت ایں بگفت و ند قدح — گر تو نوشی مے بماہ روزہ ہم کافر شوی

گنبد بیدر ہمیں یک دہر و در وی صد بلا
تفتہ بر دل از چہ رہ زیں گنبد بیدر شوی

کتابیات

بزمِ غالب	عبدالرؤف عروج	کراچی، ادارۂ یادگارِ غالب	۱۹۶۹ء
پنج آہنگ	مترجمہ محمد عمر مہاجر	کراچی، ادارۂ یادگارِ غالب	۱۹۶۹ء
تضمینِ گلستاں	تفتہ	کانپور، نول کشور	۱۸۷۳ء
تلامذۂ غالب	مالک رام	نکودر، مرکز تصنیف و تالیف	۱۹۵۷ء
خطوطِ غالب	مرتبہ مالک رام	علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۶۲ء
خطوطِ غالب	مرتبہ مہیش پرشاد	الہ آباد، ہندستانی اکیڈمی	۱۹۴۱ء
خمخانۂ جاوید (حصہ دوم)	لالہ سری رام	دہلی، دلی پرنٹنگ ورکس	۱۹۱۱ء
دیوانِ چہارم	تفتہ		۱۸۶۹ء
ذکرِ غالب	مالک رام	نئی دہلی، مکتبہ جامعہ	۱۹۵۵ء
روزِ روشن	مظفر حسین صبا	بھوپال، مطبع شاہجہانی	۱۲۹۷ھ
سنبلستاں	تفتہ	میرٹھ، مطبع مرآت الصحائف	۱۲۷۸ھ
صبحِ گلشن	سید علی حسن خاں	بھوپال، مطبع شاہجہانی	۱۸۷۸ء
غالب اور سرور	ایم حبیب خاں	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔	۱۹۷۵ء
فیضانِ غالب	عرش ملسیانی	نئی دہلی، غالب اکیڈمی	۱۹۷۷ء
گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش صابر	لاہور، مجلس ترقی ادب	۱۹۶۶ء
گلشنِ ہمیشہ بہار	نصر اللہ خاں خویشگی	کراچی، انجمن ترقی اردو	۱۹۶۷ء
مکاتیبِ غالب	مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی	بمبئی، مطبعہ قیمہ	۱۹۳۷ء